اقبالؒ - قائدِ اعظمؒ اور پاکستان
راجا رشید محمود

راجا رشید محمود

نذیر سنز پبلشرز
۴۰-اے اُردو بازار
لاهور - پاکستان

اقبال، قائد اعظم اور پاکستان
صفحات : ۱۶۰
اشاعت اوّل : ۱۹۸۳ء
خوشنویس : خلیل احمد نوری
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز۔ لاہور
ناشر
نذیر حسین
نذیر سنز پبلشرز
۴۰ اے، اردو بازار لاہور

قیمت ۲۵ روپے

پیارے ابا جان

راجا غلام محمدؒ

کے نام

جن کی تربیت نے مجھے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا ولولہ بخشا

خدا آں ملّتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت
بہ آں ملّت سروکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

(علامہ محمد اقبالؒ)

آئینہ

عزائم

جبینِ ارض کو مہرِ درخشاں کر کے چھوڑیں گے
ہم ان ذرّوں کو تاروں سے بھی تاباں کر کے چھوڑیں گے

جہانِ معدلت پر یہ بھی احساں کر کے چھوڑیں گے
مُساوات و اخوت کو فراواں کر کے چھوڑیں گے

عمل کے جوش میں شادابیٔ بُستاں کے متوالے
وطن کو غیرتِ صد باغِ رضواں کر کے چھوڑیں گے

جہاں میں ہر طرف الفت کے گُل بوٹے سجائیں گے
زمینِ شور کو بھی سُنبلستاں کر کے چھوڑیں گے

ہُوا کیا، راہ میں حائل ہیں گر کچھ مشکلیں اب تک
ہر اک عقدے کو حل، مشکل کو آساں کر کے چھوڑیں گے

یہ دستورِ زباں بندی پنپنا سخت مشکل ہے
چمن کے پتّے پتّے کو غزل خواں کر کے چھوڑیں گے

وطن میں لے ہی آئیں گے نظامِ مصطفیٰ آخر
عروسِ فکر کے چہرے کو خنداں کر کے چھوڑیں گے

(راجا رشید محمود)

دیباچہ

آزادی منّ و سلویٰ نہیں کہ کسی تگ و دو کے بغیر دستیاب ہو جائے۔ یہ کوئی ایسا پھل بھی نہیں جسے ہم محض اپنی خواہش کے زیرِ اثر ہاتھ بڑھا کر درخت سے اتار لیں یا وہ خود ٹوٹ کر ہماری گود میں آ گرے اور ہم اسے نگل لیں۔ یہ ایسا گوہرِ مقصود ہے جو اپنی تلاش میں سرگرداں لوگوں یا قوموں کو ملتا ہے، اِس تک رسائی ایسوں کا مقدر بھی نہیں ہوتی جو دوسروں کی قربانیوں کے نتیجے میں اسے حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہوں اور اِنَّا ھٰھُنَا قَاعِدُوْن کے گروہ سے متعلق رہنا چاہیں۔

آزادی وہ بھی نہیں جس کے لیے آپ کو "پاکھنڈی" بننا پڑے، جس کے حصول کی کوشش میں آپ گفتار و عمل میں تضاد کا ہیولیٰ بن کر کھڑے ہوں ——
—— حقیقی آزادی وہ بھی نہیں جس کے لیے آپ کو بیگانوں کا مرغِ دست آموز بننا پڑے یا کفر کی کسی نہ کسی طاقت کا دست نگر ہونا ضروری ہو۔ کبھی سکھوں کے خلاف لڑنا ہو تو انگریز حکومت کی اشیرباد اور امداد ضروری ہو اور بعد میں انگریزی عملداری سے چھٹکارا پانے کے اِدّعا میں ہندو سکھوں کا تابعِ مہمل بن کر چلنا پڑے۔

آزادی کی راہوں پر بیساکھیوں کے سہارے نہیں چلا جا سکتا۔ اس کے لیے پہلے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اپنا وزن کرنا پڑتا ہے۔ پھر راہ کی صعوبتوں کو خاطر

ہیں نہ لانے کے عزم کی قیادت ہیں چلیں تو نصب العین کی لگن معاونت کرتی ہے۔

اگر آپ آزادی کے نام پر دائمی غلامی کے لیے ساعی رہیں، اگر آپ ایگزینڈر کی غلامی سے نکل کر بنسی لال کی غلامی کے حلقے میں داخل ہونے کو آزادی کی معراج قرار دیتے رہیں —— تو آپ کس آزادی کا ذکر کرتے ہیں، کیسی "آزادی" کے پرچارک ہیں؟؟

اقبال، قائدِاعظم اور پاکستان کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ آزادی کے حصول کے لیے برِّصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں نے کیا کیا، ہندوؤں اور ہندوؤں کے اجیروں کا رویّہ کیا رہا، شاعرِ مشرق اور بابائے قوم کے فکر کی سمت راست تھی یا نہیں، حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی محبت اور ان کے لائے ہوئے دین کی سربلندی ان کا مطمحِ نظر تھی یا نہیں؟ —— اُنہوں نے اسلام کے عمل اور برِّصغیر کے مسلمانوں کی "حفاظت گاہ" کے طور پر ایک مملکت کے حصول کے لیے آواز بلند کی، کچھ لوگ ان کے ہمقدم تھے، کچھ نے مخالفت کی۔ مخالفت کی بنیاد کی تھی، حمایت کا مقصد کیا تھا۔ نتیجہ کیا نکلا ہے —— اور آج اس ساری جدّ و جُہد کے تناظر میں ہمیں کیا کرنا ہے۔

راجا رشید محمود
اظہر منزل
نیو شالامار کالونی۔ ملتان روڈ۔ لاہور

۱۴ اگست ۸۳ء

اقبالؒ اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ایمان کی بنیاد عشقِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہے۔ خداوندِ قدوس وکریم نے اپنے محبوب پاک کی تعریف و ثنا کی، انہیں مختلف خطابات سے پکارا، ان پر درود بھیجنے کو اپنا اور فرشتوں کا وطیرہ قرار دیا اور اہلِ اسلام کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنے آقا و مولا علیہ التحیۃ والثنا پر درود و سلام کے پھول نچھاور کریں۔ خالق و مالکِ کائنات نے نہ صرف انہی لوگوں کو مومن کہا ہے جو ہر معاملے میں سرکار کو اپنا حکم تسلیم کریں۔ اُس نے ان کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ گردانا اور اُن کی بیعت کو اپنی بیعت فرمایا اور یہ بھی کہا کہ جو شخص مجھ سے محبت کا دعوے دار ہو، وہ حضورِ پُرنور کی اتباع کرے تو میں اس سے محبت کرنے لگوں گا ـــــ پھر سرکارِ دوعالم نورِ مجسّم ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی وضاحت فرمادی۔ وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحیٰ کے مصداق سرکار کا فرمان کبریا کا فرمان ہے۔ سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ نے فرمایا کہ مجھے اپنے والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب و محترم نہ رکھنے والا صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتا۔

جب اِس معاملے میں کتاب و سنت کی تعلیمات واضح ہیں، جب اساسِ ایمان کی تشکیل خدا اور رسولِ خدا نے خود کر دی تو ہر وہ فرد جو حبالۂ ایمان میں آتا ہے اسے عشقِ رسولؐ سے آگاہی ہوتی ہے اور وہ اسلام کی برکات سے متمتع ہونے کا قصد کرتا ہے۔ پھر وہ آدمی اس راہ سے کیسے بھٹک سکتا ہے جس کا گھریلو ماحول دینی ہو، جس کے والد نے اُس کی تشکیلِ سیرت پر خصوصی توجہ دی ہو، جس نے اسلامیات کی فاضل شخصیتوں سے استفادہ کیا ہو، پھر تعلیماتِ دین کے تناظر میں کائنات اور اسرارِ کائنات کی چھان بین کی ہو، مغرب کے علوم کی غواصی

کرتے ہوئے بھی ارشادات رسولِ پاک کی آکسیجن نے اسے زندہ رکھا ہوا ور وہ پہلے کی طرح اس بحرِ ظلمات سے بھی منور و منور ہی باہر آیا ہو، اس کے ایمان کی بنیاد میں جو مٹی گارا استعمال کیا گیا تھا اس کے باعث وہ کفر و الحاد کے جھکڑوں اور مغربیت کے گرد بادوں سے محفوظ و مامون رہا۔ غیر اسلامی تہذیب و تمدن کی چکاچوند سے بھی اس کی آنکھیں نہ چُندھائیں، زمانے کے نشیب و فراز اور حالات کی ناسازگاری نے بھی اس کے کردار کی پختگی پر کوئی کامیاب حملہ نہ کیا۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ اقبال نے عشقِ رسولِ مقبول کو اپنی زندگی کا جزوِ لازم بنا لیا تھا، اُنھوں نے انسانیت اور اس کے شرف کا ذکر کیا ہے، اسلام اور اُس کے شعائر کا تذکرہ چھیڑا ہے، ملحدانہ افکار و نظریات کی تغلیط کی ہے، دنیا کو فلسفے کی نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے اور اسلامیانِ ہند یا مسلمانانِ عالم کو سرفرازی کی راہیں سجھائی ہیں ——— اور اس میں عشقِ مصطفیٰ کے جذبے کو رہنما بنایا ہے اور ذوق کے اِس پہلو سے تعمیر کے سارے پہلوؤں کو آشکار کیا ہے۔

حضورِ پُرنور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے حوالے سے علامہ اقبال کی طبیعت میں سوز و گداز تھا، رسولِ انام علیہ السلام کے ذکر میں ان کی دردمندی ہر سچے عاشقِ رسولؐ کی طرح ضرب المثل بن گئی ہے۔ وہ سرکار کی محبت میں اس قدر سرشار تھے کہ جونہی ذکرِ خیرالانام چھڑتا، ان کی آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

فقیر سید وحید الدین "روزگارِ فقیر" حصہ اول میں لکھتے ہیں:

"ذاتِ رسالتمآب کے ساتھ انہیں جو والہانہ عقیدت تھی، اس کا اظہار اُن کی چشمِ نمناک اور دیدۂ تر سے ہوتا تھا۔" (ص ۴۹)

"ملفوظاتِ اقبال" میں مرزا جلال الدین بیرسٹر رقم طراز ہیں:

"وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" سنتے ہی ان کا دل بھر آتا اور وہ اکثر بے اختیار رو پڑتے۔"

بڑودہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر وحید اشرف کہتے ہیں۔

"اقبال کے اشعار میں اسلام کا فلسفۂ حیات مضمر ہے لیکن یہاں فلسفہ فلسفہ نہیں رہ جاتا بلکہ عشقِ رسولؐ کے جذبے میں ڈھل کر شعر کا پیکر اختیار کرتا ہے جس کے بغیر اقبال کی شاعری مجرّد فلسفہ ہو کر رہ جاتی۔"

(المیزان بمبئی، امام احمد رضا نمبر ص ۵۶۴)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

"اِن کے فکر و فن کا نقطۂ آغاز بھی رسالت ہے اور نقطۂ ارتقا و اتمام بھی رسالت ہے۔"

(اُردو کی نعتیہ شاعری ص ۷۵)

پروفیسر ڈاکٹر امانت، واڈیا کالج پونہ (بھارت) کہتے ہیں:

"اقبال کی شاعری دراصل رسول کریمؐ کے اُسوۂ حسنہ کی آئینہ دار ہے جو منطقی، حکیمانہ، ادیبانہ اور شعری دلآویزیوں کے ساتھ نغمۂ حیات بن کر زندگی کا پیغام پہنچا رہی ہے۔"

(سہ ماہی نوائے ادب بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

فقیر وحید الدین کی گواہی ہے کہ:

"ڈاکٹر صاحب کا دل عشقِ رسولؐ نے گداز کر دیا تھا۔ زندگی کے آخری زمانے میں تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آ جاتا تھا تو ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے"

(اقبال بزرگ و پیرشک، مرتبہ شمیم حیات سیال، ص ۷۲)

علامہ اقبال کے ارتحال سے چند دن پہلے مولانا غلام مرشد زیارت کے لیے گئے تو دیکھا کہ "علامہ کے لبوں سے حضور کا ورد جاری تھا اور اُن کی نگاہیں اشکبار تھیں"

(فکر و نظر اسلام آباد۔ اقبال نمبر حصہ دوم ۱۹۷۸ء ص ۶۴)

ایک دفعہ انہیں مضطرب دیکھ کر حکیم احمد شجاع نے وجہ دریافت کی تو اُنہوں نے کہا:
"احمد شجاع! میں یہ سوچ کر اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے"

خدا نے اس عاشق رسول کی اِس تمنا اور دعا کو قبول فرمایا یعنی اقبال ۶۱ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ (روزگار فقیر جلد دوم ص ۷۰)

باعث تخلیق دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا یہ جذبہ اقبال کے رگ و پے میں یوں سرایت کر گیا تھا کہ حضور کی تعریف کرتے تو روتے، سرکار کا ذکر سنتے تو کیفیت طاری ہو جاتی، اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کہتے ہیں کہ

"جب عاشقان رسول ؐ کا تذکرہ کرتے، اس وقت بھی آبدیدہ ہو جاتے"

(بصیر کراچی، مئی ۱۹۷۲ء۔ ص ۲۷)

کبھی اپنی بے بضاعتی پر غور کرتے تو سرکار کے حضور حاضری کے خیال سے کانپ اُٹھتے۔ اسی کیفیت میں کہا ہے کہ:

بپایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ما را
حساب من ز چشم او نہاں گیر (ارمغان حجاز ص ۲۳)

فقیر سید وحید الدین کہتے ہیں کہ جب علامہ گول میز کانفرنس سے واپس آئے تو میرے والد نے انہیں کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی

آنکھیں نورانی کر لیتے۔ یہ سنتے ہی ان کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر کہنے لگے "فقیر! میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا؟" (روزگارِ فقیر، جلد اول ص ۴۶، ۴۷)

کبھی اقبال اپنے آپ سے نظر ہٹا کر سرکار کے کرم پر نگاہ رکھتے ہیں تو دراقدس پر حاضری کی تمنا کو زبان دے دیتے ہیں۔ سید غلام میراں شاہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور کے روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جاؤں تاہم حضور کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے کہ فرمایا الطالح لی (گنہگار میرے لیے ہے)" (اقبال نامہ حصہ اول، ص ۲۲۸)

میر غلام بھیک نیرنگ علامہ اقبال کے سرکار سے قلبی تعلق کے پیش نظر اور حضور کے ذکر میں ان کی دگرگوں حالت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

"میں نے اُن کے سامنے تو نہیں مگر خاص لوگوں سے بطورِ راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور کے مرقدِ پاک پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے، وہیں جاں بحق ہو جائیں گے۔" (اقبال لاہور۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۲۰)

اقبال خود بھی مدینہ طیبہ میں حاضری کی انہی معنوں میں تمنا کرتے رہے۔ عرضِ مدعا سے پہلے اظہارِ ندامت کرتے ہیں کہ میرا دامن عمل سے خالی ہے مگر آپ کی بے پایاں رحمت اور بے کراں کرم نے مجھے جرأتِ اظہارِ تمنا بخشی ہے۔ آپ نے بُصیری کو جذام سے نجات دی اور آپ دو جہاں کے لیے رحمت ہیں، میرے ستارے کو بھی بلندی عطا فرمایئے کہ مجھے مدینہ پاک میں موت آئے اور میرے مرقد کو آپ کا سایۂ دیوار نصیب ہو۔

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش (اسرار و رموز)

جو شخص حضورِ رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام بلند کے بارے میں جان لے گا وہ زندگی بھر انہی کی رحمت چاہے گا اور انہی کے سایۂ رحمت میں موت کی خواہش بھی کرے گا۔ ۱۴ جنوری ۱۹۲۳ء کے ایک مکتوب میں علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ ہوا کرتے تھے۔"

(فیضانِ اقبال، مرتبہ شورش کاشمیری۔ ص ۲۸۷)

بات یہیں پہ ختم نہیں ہو جاتی کہ اقبال کا یہ عقیدہ تھا، اس کا عمل بھی یہی تھا، —— اس پہ سرکار نے کرم بھی کیا۔ ۱۳ جون ۱۹۳۶ء کو پروفیسر الیاس برنی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۳ اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب میں نے سرسید کو خواب میں دیکھا، پوچھتے ہیں، تم کب سے بیمار ہو، میں نے عرض کیا، دو سال سے اوپر مدت گزر گئی، فرمایا۔ حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرضداشت کے چند شعر، جو اب طویل ہو گئی ہے، میری زبان پر جاری ہو گئے،۔۔۔ ۴ اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رنگ عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔"

(اقبال نامہ حصہ اول، ص ۳۴۱) ۔ ۲۹ جون ۱۹۳۶ء کو سرسید کے پوتے سر راس مسعود کے نام ایک خط میں بھی یہی ذکر ملتا ہے (خطوطِ اقبال، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی۔ ص ۲۶۳)

اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنت شاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا۔

اس کے طفیل حج بھی خدا نے کرا دیے
اصل مراد حاضری اُس پاک در کی ہے

"ارمغانِ حجاز" میں علامہ کا بھی یہی موقف ہے:

در آں دریا کہ اُو را ساحلے نیست
دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی، رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جُز تو ما را منزلے نیست

۱۳ جون ۱۹۲۷ء کو سر اکبر حیدری کے نام ایک خط میں بھی لکھتے ہیں:

"میرا ہر بُن مُو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے اور میری روح ایک بھرپور اظہار کی طالب ہے، جو صرف آپ کے مزارِ اقدس پر ہی ممکن ہے۔ اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میرا حج اظہارِ تشکر کی ایک شکل ہوگی۔"

(خطوطِ اقبال۔ ص ۲۷۸)

حضراتِ محترم! — سورج تو مغرب میں غروب ہوتا ہی ہے، اقبال اس کی غایت پر غور کرتے ہیں تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ:

عظمت ہے خاص پاک مدینے کی خاک کو
خورشید بھی گیا تو وہاں سر کے بل گیا

علامہ اقبال کا کوئی بھی مجموعۂ کلام دیکھ لیں، ان کے مکاتیب پر نظر دوڑائیں، ان کے ملفوظات کا مطالعہ کریں، ان کے پاس اُٹھنے بیٹھنے والوں سے ان کے شب و روز کے بارے میں پوچھیں —— محسنِ انسانیت ہادیٔ سبل، ختم الرسل، مولائے کل صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و ارادت کی مختلف شکلیں سامنے آئیں گی۔ بانگِ درا میں انسان کے شکوے کے جواب میں خدا کہتا ہے کہ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

"پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں علامہ محمد بن سعید بوصیریؒ کے حوالے سے اقبال بارگاہ رسولِ مقبولؐ میں صحت طلبی کے لیے لب کھولتے ہیں۔

چُوں بُصیری از تو می خواہم کشود
تا بہ من باز آید آں روزے کہ بود

"بالِ جبریل" میں اقبال فلسفۂ معراج پر خامہ فرسائی کرتے دکھائی دیتے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اسی مجموعے میں یہ زبان زدِ خاص و عام شعر بھی ہیں:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غُبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

اقبال کی نعت گوئی پر کسی مفصل گفتگو یا اُن کے عشقِ رسولؐ کی جزئیات پر بات چیت کے بجائے آج میں صرف بہ اجمال اُن کی ایک نظم کا تذکرہ کرتا ہوں۔ یہ نظم اُنھوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں "ابرِ گہر بار" کے عنوان سے پڑھی تھی، بعد میں "فریادِ اُمت" کے نام سے چھپی۔ اس میں کبھی تو صدمۂ ہجر کی لطف انگیزیوں کے ناز اُٹھاتے ہیں:

صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ
یہ بھی اک ناز ہے تیرا، نہ اُٹھاؤں کیونکر

کبھی اس صدمے کے باعث زندگی سے پشیماں دکھائی دیتے ہیں:

دور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں
یہ بھی جینا ہے کوئی، جس سے پشیماں ہوں میں

کبھی اپنے قلب میں جھانکتے ہیں تو اس کی رفعتوں پر حیرت زدگی کے عالم میں مستغرق ہوتے ہیں۔

اُس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانہ دل
عرش کا ہے، کبھی کعبے کا ہے دھوکہ اس پہ
کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل

اور پھر سیّدِ مکی مدنی العربی سے مدد کی درخواست کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے
میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

پھر عشقِ رسولؐ کے جذبے کی شدت یہ انداز اختیار کرتی ہے،

تری اُلفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا
قابِ قوسین بھی، دعویٰ بھی عبودیت کا
کبھی چلمن کو اُٹھانا، کبھی پنہاں ہونا
یہی اسلام ہے میرا، یہی ایماں میرا
تیرے نظارۂ رخسار سے حیراں ہونا

جی تو چاہتا ہے کہ اس نظم کے اسرار و رموز پر اپنے فہم کے مطابق گفتگو کروں لیکن ڈر ہے کہ شرح کی کوشش میں کہیں نظم کا لطف ہی غارت نہ ہو جائے۔
اس لیے صرف علامہ اقبال ہی کو سنیئے،

حشر میں ابرِ شفاعت کا گھر بار آیا
دیکھ اے جنسِ عمل، تیرا خریدار آیا
پیراہن عشق کا جب حُسنِ ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا
میں نے سو گلشنِ جنت کو کہا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

اور

ما عرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری
قاب قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری
تیرے قربان میں اے ساقیٔ میخانۂ عشق
میں نے اک جام کہا، تو نے دیے خم مجھ کو
موت آجائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اُٹھوں جو مسیحا بھی کہے قُم مجھ کو
خوف رہتا ہے یہ ہر دم کہ رہِ یثرب میں
طور کی سمت نہ لے جائے تو ہم مجھ کو

اب علامہ اقبال قوم کی حالت بیان کرنا چاہتے ہیں، آقا و مولا علیہ التحیۃ والثناء سے استمداد کی درخواست کرنے والے ہیں ــــــ اس لیے سرکار کو اُن کے لطف و کرم کے حوالے سے پکارتے ہیں:

اے کہ تھا نوحؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیمؑ کو آتش میں بھروسا تیرا
اے کہ مشعل تھا ترا ظلمتِ عالم میں وجود
اور نورِ جبہِ عرش تھا سایہ تیرا

اے کہ پرتو ہے ترے ہاتھ کا مہتاب کا نور
چاند بھی چاند بنا، پا کے اشارہ تیرا
گرچہ پوشیدہ رہا حُسن ترا پردوں میں
ہے عیاں معنیٔ لولاک سے پایہ تیرا
ناز تھا حضرتِ موسیٰ کو یدِ بیضا پہ
سو تجلّی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا
چشمِ ہستی صفتِ دیدۂ اعمیٰ ہوتی
دیدۂ کُن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا

اس کے بعد اقبال قوم کے حالِ زار کا نقشہ کھینچتے ہیں، امراء اور واعظین کی کمزوریاں گنواتے ہیں اور آخر میں اس یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ ہر مصیبت سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی رہائی دلا سکتے ہیں اور ان کے سوا کون ہے، جس کے آگے یہ رونا رویا جائے۔

اس مصیبت میں ہے اک تو ہی سہارا اپنا
تنگ آکر لبِ فریاد ہوا وا اپنا
دیکھ اے نوحؑ کی کشتی کے بچانے والے
آیا گرداب حوادث میں سفینہ اپنا
اِس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سُنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانہ اپنا
یوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت
ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا
داستاں درد کی لمبی ہے، کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنا تجھ سے (باقیاتِ اقبال)

آپ جانتے ہیں کہ علامہ اقبال ابنائے اسلام کو انفرادی طور پر اور اجتماعی حیثیت سے کمزور، بے پایاں اور سرنگوں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ احیائے دین کے لیے کمربستہ رہے، وہ مسلمان کو شاہین کی صورت میں بلند پرواز دیکھنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں نظم و ضبط، عزم و استقلال، استقامت و ایثار، فقر و غیرت، خودی و خودداری صرف اسی طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اس کا دل عشقِ مصطفیٰؐ سے مملو ہو جائے، اس کا دماغ عظمتِ مصطفیٰؐ کا قائل ہو اور اس کی روح رحمتِ مصطفیٰ سے سرشار ہو جائے۔ اس کے لیے وہ خالقِ کائنات کے کلام کی رُو سے، کائنات اور تخلیقِ کائنات کے حوالے سے اور حالاتِ زمانہ کے اعتبار سے عشقِ مصطفیٰ کا درس دیتے ہیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی، تمام بولہبی ست

خدا کرے، ہم اقبال کے اس درس کو روح و جاں میں بسالیں اور کائنات کو عشق کے اس پیغام سے منوّر کر دیں۔ آمین۔

پیغامِ اقبال کا محور

عشقِ مصطفیٰ وہ مرکزی نقطہ ہے، جس کے گرد اقبال کا پورا پیغام گھوم رہا ہے۔ اقبال کے نزدیک فرد کا دینِ متین پر یقین، تعلق باللہ کی کیفیات کا راز اور من حیث المجموع امتِ مسلمہ کی بقا اور سلامتی عشقِ رسول میں پوشیدہ ہے۔ وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

راہِ مصطفیٰ (علیہ التحیۃ والثنار) سے ہٹ کر اہلِ اسلام کے لیے دنیا میں عزت و آبرو اور توقیر و عظمت کے ساتھ زندہ رہنا ممکن ہی نہیں۔ علامہ بار بار یہی کہتے ہیں کہ میں نے تقدیر کے چہرے سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ اے مسلمان! نا امید نہ ہو اور راہِ مصطفیٰ اختیار کر۔ یعنی اگر آقا و مولیٰ کی راہ اختیار کی جائے تو نا امید ہونے کا کوئی جواز نہیں۔

کشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو نومید و راہِ مصطفیٰ گیر

علامہ اقبال نے اس شخصیت کی تعریف و ثنا کو اپنا شعار بنایا، جس کے بغیر نہ خدا کی ربوبیت کا اظہار ہوتا، نہ قرآن نازل ہوتا، نہ فروغِ وادیٔ سینا کا ذکر چھڑتا۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل ، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

اقبال جہاں کائنات کے وجود کو حضور کے نور کا کرم جانتے ہیں، وہاں عرفانِ نفس کا باعث بھی اسی کو سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اس بُت خانے میں اپنی نوائے صبح گاہی سے میں نے ایک جہانِ عشق و مستی تعمیر کر لیا ہے۔

چو خود را در کنارِ خود کشیدم
بہ نورِ تو مقامِ خویش دیدم
دریں دیر از نوائے صبح گاہی
جہانِ عشق و مستی آفریدم

اقبال کہتے ہیں کہ ضعیفی کے باوصف اگر سرکار کا نور میری آنکھوں کو متنیر کرے تو مجھے تابِ نظر حاصل ہو سکتی ہے۔

ہنوز ایں خاک دارائے شرر ہست
ہنوز ایں سینہ را آہِ سحر ہست
تجلّی ریز بر چشمم کہ بینی
باایں پیری مرا تابِ نظر ہست

قرآن مجید فرقان حمید نے ہمارے آقا و مولا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف خطابات سے نوازا ہے، جن میں ایک خطاب ہے "عبدہٗ" کا۔ علامہ اقبال 'جاوید نامہ' میں مفہوم عبدہٗ کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلکِ مشتری پر حلاج کہتا ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفیؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیؐ ست
(ہر کہیں پیدا ہے شہرِ رنگ و بُو
خاک سے جس کی ہو پیدا آرزو
ہے وہ ممنوں مصطفیؐ کے نور کا
یا ہے وہ جویائے نورِ مصطفیؐ)

(ترجمہ انعام اللہ خاں ناصر)

اس پہ 'زندہ رود' اس سے اس جوہر کے بارے میں استفسار کرتا ہے، جس کا نام مصطفیٰ ہے۔ علامہ اقبال حسین بن منصور حلاج کی زبان سے مفہوم عبدہٗ کے بارے میں حتی المقدور وضاحت کرتے ہیں اور آخر میں اپنے عجزِ فہم کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی اس لفظ کو سمجھنا چاہتا ہے تو وہ "وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" کے مقام کو سمجھے۔ فرماتے ہیں:

عبدہٗ از فہمِ تو بالاتر است
زاں کہ او ہم آدم و ہم جوہر است
(فہم سے وہ تیرے بالاتر بھی ہے
عبدہٗ آدم بھی ہے، جوہر بھی ہے)

عبد دیگر، عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار، او منتظر
(عبد کم تر، عبدہٗ عالی وقار
منتظر وہ، ہم سراپا انتظار)

عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست
ما ہمہ رنگیم و او بے رنگ و بوست
(عبدہٗ سے دہر ہے، دہر عبدہٗ
ہم ہیں سب رنگ، وہ بے رنگ و بو)

عبدہٗ با ابتدا ، بے انتہاست
عبدہٗ را صبح و شام ما کجاست

(عبدہٗ آغازِ بے انجام ہے — عبدہٗ آزادِ صبح و شام ہے)

اور آخری اور فیصلہ کن بات علامہ اقبال حلاج کے منہ سے یوں ادا کرتے ہیں،

کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست

(کون اس کے بھید سے آگاہ ہے — عبدہٗ اک رازِ "الّا اللہ" ہے)

علامہ کہتے ہیں کہ لاالٰہ تلوار ہے اور اس کی دھار عبدہٗ ہے، بلکہ اگر زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں سننا چاہو تو دونوں ایک ہیں، تلوار اور دھار میں فرق کیا ہی نہیں جا سکتا۔

لاالٰہ تیغ و دم اُو عبدہٗ
فاش تر خواہی بگو "ہُو عبدہٗ"

اور آخر میں علامہ کہتے ہیں کہ جب تک قرآن پاک یہ وضاحت نہ کرے کہ کنکریاں پھینکنے والا ہاتھ جو سرکار کا ہاتھ تھا، دراصل خدا تعالیٰ کا ہاتھ تھا، "ہُو عبدہٗ" کی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔

مدعا پیدا نہ گردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ "ما رمیت"

(کشفِ معنی کر سکیں کیا اک دو بیت — دیکھ تو سوئے مقامِ مارمیت)

علامہ اقبال اپنی اسی تصنیف "جاوید نامہ" میں جرمن فلاسفر نطشے کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کرتے ہیں کہ یہ بدقسمت شخص "لا" کے مقام تک رسائی حاصل کر چکا ہے مگر "الا اللہ" تک نہیں پہنچ سکا اور مقام عبدہٗ سے بے گانہ رہا۔

اُو بہ "لا" درماندہ، تا "اِلاّ" نہ رفت
از مقام عبدہٗ بیگانہ رفت

سِرِ عبدہٗ سے آگاہ ہونے کے عمل میں سر کا سجدہ نہیں مگر حضورِ شاہ میں دل کا سجدہ تو یوں بھی ناگزیر ہے کہ آقا نے خود ہی فرمادیا "من رآنی فقد رائی الحق" (یعنی جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھ لیا) پھر علامہ اقبال یہ اعتراف کیوں نہ کریں کہ میری آنکھوں کو نگاہ سرکار ہی نے بخشی ہے اور میری زندگی کی رات میں چاند کی روشنی آپ ہی کے کرم سے ہے ـــــ اور پھر حضورؐ کے اس ارشاد کے حوالے سے اُن کے رُخِ زیبا کی زیارت کی خواہش کیوں نہ ظاہر کریں۔

بچشم من نگہ آوردۂ تُست
فروغِ لاالہٰ آوردۂ تُست
دوچارم کن بہ صبح "مَن رَآنی"
شبم را تابِ مہ آوردۂ تُست

حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے فرمایا "لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ نبی مرسل ولا ملک مقرب" یعنی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ میں خدا کے ساتھ تنہا ہوتا ہوں۔ اس وقت نہ کوئی مرسل وہاں آسکتا ہے اور نہ کوئی فرشتۂ مقرب۔ علامہ اقبال پر اس حدیثِ پاک کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اُنہوں نے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" (اپنے مشہور لیکچروں) میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ 'مثنوی اسرارِ خودی' میں کہتے ہیں:

تو کہ از وصل زماں آگہ نہ ای
از حیاتِ جاوداں آگہ نہ ای
تا کجا در روز و شب باشی اسیر
رمزِ وقتِ "لی مع اللہ" یاد گیر

علامہ نے اس حدیث مبارکہ کا ذکر "جاوید نامہ" میں بھی کیا ہے۔ زروان (وقت) کہتا ہے (انعام اللہ خاں ناصر نے ان اشعار کا ترجمہ یوں کیا ہے)

لی مع اللہ جس کے دل میں بس گیا
اس نے میرے سحر کو باطل کیا
چاہتا ہے تو اگر مجھ سے اماں
لی مع اللہ کو بنا وردِ زباں
لی مع اللہ ہے نہ جانے سحر کیا
میری نظروں سے یہ عالم چھپ گیا

علامہ اقبال عشق مصطفیٰ میں افضل الخلائق بعد الانبیاء حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روش کے عامل ہیں اور جب رفیق نبوت کی زبان سے یہ نعرۂ حق سنتے ہیں تو اس کو حرزِ جاں بنا لیتے ہیں کہ

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

وہ جانشین سرکارِ دو عالم حضرت صدیق اکبر کی جرأت پر دل و جاں سے فدا ہیں، جنہوں نے خدا سے کہہ دیا کہ مجھے مصطفیٰ کی ہستی کافی ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ جس کے لیے سرکار کافی ہوں، نہ وہ گمراہ ہو سکتا ہے، نہ احکام خدا اور رسولؐ سے سرتابی کی جرأت کر سکتا ہے)

بگوئے تو گدا ازیک نوا بس
مرا ایں ابتداء، ایں انتہا بس
خرابِ جرأتِ آں رندِ پاکم
خدا را گفت: "ما را مصطفیٰ بس"۔

'جاوید نامہ' میں وہ 'محکمات عالم قرآنی' کی ذیل میں کہتے ہیں کہ خدا کا انکار ممکن ہے مگر شانِ نبی کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

می توانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

اور اس کا باعث شاید یہ ہے کہ،

با خدا در پردہ گویم باتو گویم آشکار
یا رسول اللہ! اُو پنہان و تو پیدائے من

اس معاملے میں علامہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے موقف کے قائل ہیں اور عارفۂ ملت حضرت رابعہ بصری کے اس قول سے ہم آہنگ ہو کر کہ "من خدا را ازاں می پرستم کہ رب محمدؐ است" فرماتے ہیں:

تو فرمودی، رہ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو ما را منزلے نیست

وہ اپنی آسودہ جانی کے لیے وہی "شورش" مانگتے ہیں جس نے حضرت صدیق ؓ کے کاشانۂ دل کو تجلیات کا مسکن بنا دیا تھا۔

ازاں فقرے کہ با صدیقؓ دادی
بشورے آور ایں آسودہ جاں را

چنانچہ سیرت حضرت صدیق اکبر کا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ حضرت صدیق سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہے یا رسول اللہ کے ساتھ۔ تو اُنھوں نے فرمایا "مجھے اللہ کے رسول کے ساتھ زیادہ محبت ہے کیونکہ آپ کی بعثت سے پہلے ہم بھی یہیں تھے اور اللہ بھی یہیں تھا۔ نہ اس نے ہم کو پوچھا، نہ ہم نے اس کو پہچانا۔ اب جو اللہ کا رسول آگیا تو ہم نے اللہ کو پہچان لیا اور اللہ نے بھی ہم کو ——— جناب

محمد عبداللہ قریشی کہتے ہیں کہ اس کے بعد علامہ نے اپنے دو شعر سنائے، جنہیں آپ غلبۂ رقت وگریہ کی وجہ سے بمشکل پورا کر سکے۔

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

علامہ اقبال کے عشق رسولؐ کے اس پہلو کا کمال یہ ہے کہ وہ خالقِ کائنات سے التجا کرتے ہیں کہ اگر روزِ محشر میرا حساب کتاب بہت ہی ضروری ہو اور مجھے کسی طرح معاف نہ کیا جا سکتا ہو تو میری فردِ عمل سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ سے پوشیدہ رکھی جائے یعنی اگر رہائی کی کوئی صورت نہ ہو تو خدا فردِ عمل دیکھ لے اور جو چاہے سزا بھی سنا دے مگر حضورِ پرنور کے سامنے ندامت کا موقع نہ آئے۔

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر
روزِ محشر عذرہائے من پذیر
ور اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

علامہ اقبال اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے، قرآنِ پاک کے موضوعات پر کام کرنا چاہتے تھے اور اس سب کچھ سے ان کا منشا حضورِ پرنور کی خوشنودی تھا۔ سید راس مسعود کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآنِ کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں تاکہ (قیامت کے دن) آپ کے جدِ امجد (حضور نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین

کی جو حضور نے ہم تک پہنچایا، کوئی خدمت بجا لاسکا۔"

(اقبال نامہ، حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۳۶۱)

علامہ کے نزدیک مسلمانوں کے ہر قومی مرض کا واحد علاج عشق رسولؐ میں پنہاں و مضمر ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

وہ جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کو اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ اسمِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام مسلمانوں کے ایمان کی جان ہے۔ یہی نام ہے جو زبان پر جاری ہو، دل میں جاگزیں ہو، دماغ پر پر تو فگن ہو تو ہمارا تشخص ہے، ہم ہیں ——— ورنہ کچھ نہیں۔ 'بانگِ درا' میں کہتے ہیں:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

'جوابِ شکوہ' میں خداوندِ دو عالم بندۂ مومن کو مخاطب کر کے دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے اس اسمِ مبارک کی یوں تعریف کرتا ہے:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اقبال کہتے ہیں کہ عشقِ مصطفیٰؐ ہی کے کرشمے ہیں کہ بلالِ حبشی (رضی اللہ عنہ) کا نام آج تک بڑے بڑے باجبروت شہنشاہ، خدا کے سارے دوست اور اسلام کے سارے فرزند عزت واحترام سے لیتے ہیں؛

اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

اقبال کو شدید احساس ہے کہ عشقِ نبیؐ اتنی بڑی دولت ہے، جس کے حصول کے بعد کائنات کی ہر چیز مسخر ہو جاتی ہے اور عاشقِ رسولؐ کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتی ہے (جب خود خدا عاشقِ مصطفیٰؐ کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے تو ایسا کیوں نہ ہو)۔

شہیدِ عشقِ نبیؐ ہوں، میری لحد پہ شمعِ قمر جلے گی
اُٹھا کے لائیں گے خود فرشتے چراغ خورشید سے جلا کر

اقبال کہتے ہیں؛

"خوشا وہ دل جو عشقِ نبوی کا نشیمن ہو"

(انوارِ اقبال از بشیر احمد ڈار۔ ص ۲۵)

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اُوست
بحر و بر در گوشہ‌ء دامانِ اُوست

وہ خداوند کریم کے حکم کی تعمیل میں سرکار کو والدین اور دیگر تمام مخلوق سے زیادہ محبوب سمجھتے ہیں اور ان کا سینہ حضورؐ کے عشق کی آگ سے روشن اور ان کی روح آپ کے نور سے منور ہے۔

تا مرا افتاد بر رویت نظر
از اب وام گشتہ ای محبوب تر

عشق در من آتشے افروختہ است
فرقتش باد اکہ جانم سوختہ است

علامہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص عشقِ نبیؐ کی دولت سے فیض یاب ہونا چاہتا ہے تو وہ صدیق و علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا سوز خدا سے طلب کرے ؛

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرۂ عشقِ نبیؐ از حق طلب

اور —— سوزِ صدیق و علی کیا ہے ؟ اس کی وضاحت اعلیحضرت مولانا احمد رضا بریلوی یوں کرتے ہیں ؛

مولا علیؓ نے واری تری نیند پر نماز
اور وہ بھی عصر ، سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے
صدیقؓ بلکہ غار میں جاں اس پہ دے چکے
اور حفظِ جاں تو جان فروضِ غرر کی ہے
ہاں ، تو نے اُن کو جان ، انہیں پھیر دی نماز
پر وہ تو کر چکے تھے جو کرنی بشر کی ہے
ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں
اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

حضور رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ؛

"من زار قبری وجبت لہ شفاعتی (جس نے میرے روضے کی زیارت کی ، اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی)

چنانچہ حضورؐ کی شفاعت کے طالبوں کے دل و دماغ میں طیبہ کے جلووں سے مستفید و مستنیر ہونے کا شوق ناگزیر ہے ۔ علامہ اقبال ، مخدوم الملک سید غلام میراں

شاہ کے نام ۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کے مکتوب میں انہیں زیارتِ روضہ حضورؐ کی سعادت پر پیشگی مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کاش میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا اور آپ کی صحبت کی برکت سے مستفیض ہوتا لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضورؐ کے روضہ مبارک پر یاد بھی کیا جا سکوں تاہم حضورؐ کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے کہ "الطالح لی" یعنی گنہگار میرے لیے ہے۔ امید ہے کہ آپ اس دربار میں پہنچ کر مجھے فراموش نہ فرمائیں گے۔"

(اقبال نامہ، حصہ اول۔ ص ۲۹-۲۲۸)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علامہ اپنی حیات کے آخری دور میں عشق کی ان سعادتوں سے بہرہ ور ہوئے تھے، پہلے یہ عالم نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے اوائل عمر ہی سے انہیں حضور پُرنور شافع یوم النشور سے بے حد عقیدت و ارادت تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء کے محولہ بالا خط سے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اکبر الہ آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خواجہ حسن نظامی واپس تشریف لے آئے۔ مجھے بھی ان سے محبت ہے اور ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضہ رسولؐ نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھیے کب جوان ہوتی ہے۔"

(اقبال نامہ، حصہ دوم۔ ص ۲۶)

مدینے اور مدینے والے کا نام سن کر اقبال کی آنکھیں بے اختیار نم ہو جاتی تھیں۔ ۱۹۳۰ء میں بہاولپور کے ایک پیر صاحب نے سفر حج کے ذکر سے اپنی محرومی کا

احساس کر کے ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں تو ان کی بہن کہتی ہیں کہ عام صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے، اس لیے آپریشن کے بعد اگلے سال آپ بھی چلے جائیے گا۔ اس پر بڑے درد انگیز مگر پُر شوق لہجے میں فرمایا: "آنکھوں کا کیا ہے۔ آخر اندھے بھی تو حج کر ہی آتے ہیں۔" اتنا کہنے کے بعد آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔

(روز گارِ فقیر، جلد دوم، ص ۲۰۵)

حضرت غلام بھیک نیرنگ، ۱۹۳۷ء کے موسم سرما کے ایک روز کا ذکر کرتے ہیں کہ "اقبال اس وقت بہت کمزور تھے۔ سفرِ مدینہ کا ذکر بھی رہا۔ کہنے لگے "جس قدر تھوڑی سی طاقت مجھ میں باقی ہے، میں اس کو مدینے کے سفر کے لیے بچا بچا کر رکھ رہا ہوں۔" افسوس کہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

(اقبال۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء۔ ص ۳۰)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی جنوری ۱۹۳۸ء (وفات سے تین ماہ پہلے) کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سفر یورپ پر جانے سے پہلے رخصتی ملاقات کے لیے علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میری موجودگی میں انہوں نے چغتائی صاحب سے کہا کہ "اگر اللہ نے مجھے صحت دی تو میں بھی حجاز کا سفر کروں گا۔ بظاہر یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی مگر وہ چاہے تو کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔" یہ کہہ کر مرحوم پر ایک کیفیت طاری ہو گئی اور ہم دونوں اس کیفیت کا نظارہ کرتے رہے۔"

(ماہنامہ بصیر کراچی۔ عید میلاد النبی نمبر ۱۹۷۲ء۔ ص ۷۰)

اقبال اس تصور سے محظوظ ہوتے ہیں، ایک خاص کیفیت کی لذت پاتے ہیں

کہ آقا کے دربار میں حاضر ہیں، آنکھیں بند کر کے حضور کے قدموں پر نچھاور ہو رہے ہیں۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شان جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم
بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

اقبال کے نزدیک صحرائے عرب کی ہر ساعت دل نواز اور فرحت انگیز ہے۔ عرب کا ذرہ ذرہ ہماری طرح عشقِ حضورؐ کے احساس سے مملو ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ آقا کے دربار کے راستے میں قدم اس انداز میں رکھنا چاہیے کہ مقدس ذروں کا لحاظ رہے اور ان کی دردمندی کا احترام کیا جائے۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است
شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ
چو ما ہر ذرۂ او درد مند است

علامہ اقبال جنت اور خاکِ مدینہ کا موازنہ کرتے ہیں تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے،

میں نے سو گلشنِ جنت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

اور کہتے ہیں کہ مدینۂ طیبہ کو چھوڑ کر جنت میں جانا کس کو گوارا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

ہزار جنت کو کھینچتا تھا ہمیں مدینے سے آج رضواں
ہزار مشکل سے اس کو ٹالا بڑے بہانے بنا بنا کر

علامہ اپنے آقا و مولا رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آرام گاہ اور مدینہ

طیبہ کی خاک کی عظمت کا تصور کرتے ہیں تو انہیں سرکار کے قدموں کی برکت سے یہ شہر اور اس کا ذرہ ذرہ دو عالم سے بہتر لگتا ہے۔

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

وہ خواب گاہِ مصطفیٰ کو کعبہ سے سوا سمجھتے ہیں، یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسی کے دم سے سب کچھ ہے۔

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰ
دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
آہ یثرب، دیس ہے مسلم کا تو، ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں، باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

ظفر علی خاں نے اقبال کے متعلق کہا تھا:

"اقبال پکا مسلمان اور سچا عاشقِ رسولؐ ہے۔ وہ روتا ہے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عشق میں، وہ روتا ہے اسلام کی محبت میں۔"

(گفتارِ اقبال از محمد رفیق افضل۔ ص ۴،)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی اپنے ایک مضمون "اقبال اور عشقِ رسولؐ" میں لکھتے ہیں:

"مجھے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع بھی ملتا رہا۔ میں اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر بھی کہہ سکتا ہوں کہ جب کبھی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی ان کی زبان پر آیا تو معاً اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اقبال عشقِ رسول میں اس قدر ڈوب گئے تھے کہ جب عاشقانِ رسول کا تذکرہ کرتے، اُس وقت بھی آبدیدہ ہو جاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک دن مرحوم علم الدین شہید (قاتل راجپال) کا ذکر چلا تو علامہ فرطِ عقیدت سے اُٹھ کر بیٹھ گئے، آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہنے لگے " اسی گلاں کر دے رہے تے ترکھاناں دا مُنڈا بازی لے گیا۔"

(بصیر کراچی۔ مئی ۱۹۷۲ء۔ ص ۲۷)

علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں واقفانِ حال نے جس قدر ایمان افروز واقعات بیان کیے ہیں، ان سے حضرت علامہ کے دل کی کیفیت بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ غلام بھیک نیرنگ اپنے مضمون "اقبال کے بعض حالات" کے آخر میں رقمطراز ہیں:

"اقبال کا قلبی تعلق حضور سرورِ کائنات کی ذاتِ قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضور کا ذکر آتے ہی ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی، اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے۔ چونکہ میں بارہا ان کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے ان کے سامنے تو نہیں کہا مگر خاص خاص لوگوں سے بطور راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور کے مرقد پاک پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے، وہیں جاں بحق ہو جائیں گے۔ میرا

اندازہ یہی تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔"

(اقبال لاہور۔ اکتوبر، ۱۹۵۰ء ص ۳۰)

اللہ کریم ہمیں توفیق دے کہ ہم محسن قوم، شاعر مشرق، حکیم الامت علیہ الرحمہ کی تقلید میں عشق مصطفیٰؐ کی سعادتوں سے بہرہ مند ہو کر دنیا میں ایک زندہ قوم کی حیثیت سے معروف ہوں۔ آمین۔

افکارِ اقبالؒ

آج ہیں اقبال کے افکار عنوانِ بیاں
ذکر جس کا وجہِ راحت، جس کی بات آرامِ جاں

واقفِ سرِّ حقیقت، کاشفِ رمزِ حیات
وہ کہ ہے دانائے رازِ لا الٰہ اس کی زباں

شخصیت اُس کی ہمہ گیر، اُس کا پیغام آشتی
ہے پیامِ جانفزا اُس کا پئے اہلِ جہاں

اُس کا اک اک لفظ ہے تسخیرِ فطرت کی دلیل
اُس کا ہے ہر حرف تفسیرِ مکان و لامکاں

ہے خودی کی اجتماعی شکل ملّت کا وجود
ہم اگر اقبال سے پوچھیں گے ملّت کا نشاں

مشعلِ جذب و سرور و شوق پیدا ہو اگر
خضرِ راہِ دیں ہے اُس کا اضطرابِ جاوداں

اس کا ہر قول و عمل ہے اک حدیثِ دلنشیں
وہ رسولؐ اللہ کا عاشق، خدا کا رازداں

جس کے فکر و فلسفہ کی ہے اساسِ اصلِ دیں
خالقِ تخیلِ پاکستان ہے وہ نکتہ داں

ہے مفاہیم و معانی کا سمندر موج زن
اس کا ہر ہر شعر، ہر ہر لفظ ہے اک داستاں

وہ ادا فہمِ رسالت، نکتہ بینِ معرفت
آشنائے رمزِ الّا اللہ، وہ معجز بیاں

ذکر ہے اپنے لبوں پر دوستو اُس کا کہ ہے
احترامِ آدمیت کا حقیقی ترجماں

شاعرِ مشرق حکیمِ اُمّتِ مرحوم ہے
وہ کہ ہے محمودؔ ہم سب کے دلوں پر حکمراں

(راجا رشید محمود)

اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی

جب برِصغیر میں اسلام کے احیاء و نفاذ کے لیے ایک علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کا سوال اُٹھا، خدا اور رسولِ خدا (جل جلالہٗ وصلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات کی روشنی میں زندگی گزارنے کے لیے اور اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے کفر و اسلام میں تمیز اور حق و باطل میں تفاوت کو اجاگر کرنے کا موقع آیا، کفر کی ہر شکل سے نفرت کی رَو چلی اور انگریزوں یا ہندوؤں کو اپنا حاکم تسلیم نہ کرنے کی آواز بلند ہوئی ـــــ تو کچھ لوگوں نے اپنا وزن باطل کے پلڑے میں ڈال دیا، اسلام کے تخصص اور مسلمانوں کی انفرادیت کو منوانے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں، خدا اور محبوبِ خدا کے انکار و اقرار کو "ایک" قرار دیا، ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگایا، متحدہ قومیت کا شور اُٹھایا۔ اُنہوں نے ہر اُس شخصیت کو مطعون کیا، اُس کے خلاف دشنام طرازی اور اتہام تراشی کے ریکارڈ قائم کیے ـــــ جس کی زبان پر دینِ متین کے منفرد اور اعلیٰ ترین نظام کی بات تھی، اسلام کی اپنی تہذیب اور الگ معاشرت کا ذکر تھا۔ جس شخص نے بھی قرآن و سنت کے احکام کی روشنی میں کفر سے معانقہ نہیں کیا، اِن لوگوں نے اس کے خلاف مجادلہ کیا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی ہوں، ان کے جلیل القدر خلفا و رفقا ہوں، الگ اسلامی مملکت کے تصور کو مربوط اور باقاعدہ شکل میں پیش کرنے والے شاعرِ مشرق علامہ اقبال ہوں یا

مسلمانوں کے قافلہ سالار قائداعظم محمد علی جناحؒ ہوں ـــــ "ہندو مسلم اتحاد" کے عاشق نام نہاد "علماء" کی تیغِ زبان اور سنانِ قلم سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پھر جب پاکستان معرضِ وجود میں آگیا تو ان لوگوں کی کترنی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں رُک گئیں، ان کے قلم کو ٹُونی لگ گئی ـــــ اور ذرا سے توقف کے بعد اُنہوں نے قوم کے حافظے کو کمزور جانتے ہوئے پاکستان پر اجارہ داری ظاہر کرنا شروع کر دی۔

زبان سے پاکستان کو مجبوراً تسلیم کرنے والوں نے "تصدیق بالقلب" کی نعمت سے محرومی کے باوصف کچھ عرصے تک علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کو گالی دینا بند کر دیا، اُن پر بظاہر ایمان لے آئے اور دل کی بات کو چھپائے رکھا۔ ایسے میں بھی اُنہوں نے اپنی "زیرِ زمین" سرگرمیاں جاری رکھیں۔ پاکستان اُن کی اُمنگوں کا قاتل تھا، اُنہوں نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے اپنی تگ و دو جاری رکھی مگر طویل عرصے تک چھپ چھپا کر۔ اب اُن کی محنت رنگ لائی ہے، ان کی پشت پر وسائل کا انبار ہے، ان کے ہاتھوں میں اختیارات ہیں، وہ بزعمِ خود ملک و ملت پر اپنے آپ کو متصرف سمجھتے ہیں، اس لیے فضا سازگار سمجھتے ہوئے اُنہوں نے زبان کی تلواروں کو نیام سے نکال لیا ہے اور پھر اسی "متحدہ قومیت" کی راگنی کو الاپنے لگے ہیں، پھر اقبال و قائداعظم کو اتہام و دشنام کی سان پر چڑھا دیا ہے۔ پھر "ہندو مسلم اتحاد" کے داعیوں کے گُن گانے شروع کر دیے ہیں، منافقت رنگ لا رہی ہے۔

علامہ اقبال متحدہ قومیت کے سخت مخالف تھے اور "ہندو مسلم" کو ایک قوم قرار دینے والوں کے خلاف جہاد میں مصروف رہے جب حسین احمد صاحب نے ملت کو وطن سے مشتق بتایا تو علامہ اقبال کی غیرت ملی اور حمیت دینی نے شعروں کی زبان اختیار کر لی۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمدِ عربی ست
بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی، تمام بولہبی ست!

علامہ اقبال کی اس گرفت کے حوالے سے حسین احمد کے متبعین پاکستان بننے کے بعد سے خاموش رہے مگر اب پھر انہوں نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے ہیں اور پاکستان میں رہتے ہوئے علامہ اقبال کے خلاف وہی زبان استعمال کرنے لگے ہیں جو وہ ہندوؤں کی پشت پناہی کے عالم میں کرتے تھے۔ بعض رسالوں نے اقبال کے خلاف نمبر نکالے ہیں اور تصورِ پاکستان کے خالق کے خلاف ژاژ خائی اور ہرزہ سرائی کے نئے پہلو سامنے لائے جا رہے ہیں۔

حسین احمد نجیب رفیق دار التصنیف دار العلوم کراچی کہتے ہیں "علامہ اقبال عربی لغت کے لفظ "ملت" اور "قوم" میں کوئی فرق نہیں کرتے۔۔۔۔ حالانکہ قرآن و سنت میں ان دونوں کا مفہوم جُدا جُدا بیان کیا گیا ہے اور پھر علامہ کا "نظریہ ملت" بھی تو قرآن و سنت اور لغتِ عرب سے مطابقت نہیں رکھتا" (الرشید مدنی و اقبال نمبر ص ۲۱۲)، محمد متین ہاشمی بھی کہتے ہیں "مولانا مدنی نے تو "قومیں" کہا تھا۔ لفظِ ملت اور قوم میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عربی لغت اور محاورے کے اعتبار سے قوم کے لیے ہم عقیدہ ہونا ضروری نہیں بلکہ محض مجاورت (پڑوس) کی بنا پر بھی قوم کہا جا سکتا ہے" (فیض الاسلام۔ اقبال نمبر ص ۱۳۸)، جب کہ کرنل خواجہ عبد الرشید کا نقطہ ہے کہ "اگر وہ ذرا تامّل سے ملت، اُمت اور قوم کا فرق دیکھ

بنتے، از روئے قرآن ـــــ تو اُن پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ملت واقعی وطن سے بنتی ہے۔ ــ ملت کے معنٰی Nation کے ہیں اور ملتیں اوطان سے بنتی ہیں" (فیض الاسلام۔ اقبال نمبر ص ۱۳۴) ـــــ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ حسین احمد صاحب کے نزدیک ملّت اور قوم میں کوئی فرق نہیں کیونکہ بقول طالوت، "اُنہوں نے اقبال کے اشعار پر جو وضاحت کی، اس میں فرمایا کہ انہوں نے مسلمانوں کو وطنی قومیت اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا بلکہ صرف بتایا ہے کہ "آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں"ـــــ یعنی اگر اُنہوں نے ملّت کے معنوں میں قوم کا لفظ استعمال نہ کیا ہوتا تو اس پر بسیج پا ہوتے ـــ یوں کرنل عبدالرشید ملت اور قوم کو ہم معنیٰ نہیں سمجھتے لیکن اقبال کی مخالفت اور حسین احمد صاحب کی محبت میں "ملتیں اوطان سے بنتی ہیں" کے قائل ہیں متین ہاشمی اور حسین احمد نجیب ملت اور قوم کو ہم معنیٰ نہیں سمجھتے مگر "قومیں اوطان سے بننے" کا نظریہ رکھتے ہیں جب کہ اس فقرے کے مصنّف "آج کل" کے اضافے سے وقتی طور پر اپنی جان چھڑا رہے ہیں (کیونکہ مسلمانوں کے شدید ردِ عمل سے بچنے کے لیے سیاسی داؤ استعمال کرنے کے بعد بھی کئی بیانات میں پھر متحدہ قومیت کی اور قوموں کے اوطان سے بننے کی تبلیغ موجود ہے)

الرشید کے تازہ "مدنی و اقبال نمبر" میں حفظ الرحمٰن سیوہاروی اقبال کو غیر شائستہ اور غیر سنجیدہ قرار دیتے ہیں "ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار ایسے تلخ لہجے میں کیا جو اُن جیسے شائستہ اور سنجیدہ انسان کے شایانِ شان نہ تھا" (ص ۲۱) اور حسین احمد نجیب صاحب تو سورہ "الشعراء" کے حوالے سے اقبال کو گمراہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں "ان دو ارشادات کی روشنی میں، علامہ اقبال ایک فلسفی شاعر کا جو مقام و مرتبہ شریعت اسلامیہ میں متعین ہو جاتا ہے، وہ ہر ذی عقل پر

عیاں ہے۔" (ص ۲۱۱) یہی صاحب اقبال کے خلاف اپنی زبان کو مزید دراز کرتے ہیں۔
"علامہ اقبال نے جن اساتذہ سے اعلیٰ دنیاوی علوم کی تحصیل کی ہے، وہ نہ صرف غیر مسلم تھے بلکہ ان کی اسلام دشمنی پر تاریخِ عالم شہادت بیّنہ پیش کرتی ہے۔ پھر ان اساتذہ سے علامہ نے جو علوم حاصل کئے، ان کی اصل بنیاد تغیّر پذیر مغربی فلسفہ ہے۔۔۔۔۔۔ (انہوں نے) اسی مردود مغربی تہذیب کی آغوش میں نہ صرف اپنی اولاد کو سلایا۔ بلکہ برِصغیر کے اس گروہ کو ان کی ہمدردیاں حاصل ہو سکیں جو مغربی تہذیب میں سرتاپا غرق ہو چکا تھا۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ کی صفات کا حامل ایسا شخص اگر ان لوگوں پر علمی تنقید کرتا ہے جو علومِ قرآن و سنت کے نہ صرف غواص ہیں بلکہ ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق بسر ہوتا ہے تو ایسے شخص کو کس زمرے میں شمار کیا جانا چاہیئے ؟ اور پھر جو لوگ اس معاملہ میں اس کی پیروی کریں اور علماء ربّانی کے خلاف اس کی باتوں سے استدلال کریں، کیا وہ الشعراء يتبعهم الغاوون کے ارشادِ ربّانی کا مصداق قرار نہیں پائیں گے۔" (ص ۲۱۱، ۲۱۲)

یہی نجیب صاحب اپنے اسی مضمون میں اقبال کی "تلوّن مزاجی" کے تماشے دکھاتے ہیں۔ "علامہ اقبال مرحوم کے افکار و عمل میں یہ تلوّن مزاجی مغربی علوم کے تربیت یافتہ کسی بڑے آدمی سے کسی طرح کم نہ تھی۔" (۲۱۳) مسئلہ قومیت پر حسین احمد صاحب مدنی کے خلاف علامہ اقبال کے اختلاف کی چوتھی وجہ یہ صاحب دین کے بارے میں اقبال کی سطحی معلومات کو قرار دیتے ہیں۔ "دینی علوم کے بارے میں سطحی معلومات بھی علامہ کے فکر و عمل کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ قرآن و سنت کی زبان اور اس کے علوم سے براہِ راست عدمِ واقفیت اس کا بڑا سبب ہے۔" (۲۱۳) ـــــ یعنی قرآن و سنت کی زبان اور اُس کے علوم سے واقفیت صرف اُنہی کو ہو سکتی ہے جو گاندھی کو منبرِ رسولؐ پر بٹھا کر اسی

سکے چرلوں میں میٹھ جائیں، جو اسلام اور کفر کی کھچڑی پکانے کے حامی ہوں، جو ہندوؤں کی غلامی کا جوا گلے میں ڈالنے کے داعی ہوں، جو حق و باطل کو باہم شیر وشکر کر دینے کا ادعا رکھتے ہوں ــــ اور جو شخص اسلام کو ہندو ازم سے الگ سمجھتا ہو، دین کے ساتھ کفر کی پیوند کاری کا مخالف ہو، غیر مسلموں کی قیادت قبول نہ کرتا ہو، گاندھی کو اپنا ملجا وماوٰی نہ سمجھے، وہ گمراہ ہے، متلوّن ہے، مغربی تہذیب کا چربہ ہے، دینی علوم سے بے بہرہ ہے ــــ ؟ ؟

مملکت خداداد پاکستان کے بظاہر مخلص یہ باسی نظریۂ پاکستان کے شدید مخالف تھے، پکے دشمن ہیں اور کبھی اس کے اظہار سے باز نہیں آئیں گے۔ آج کل علامہ اقبال کے خلاف اُنھوں نے اپنی زبانوں کو یوں بے لگام کر رکھا ہے کہ کسی حکیم فضل الرحمٰن سواتی کا ایک مضمون الرشید میں بھی چھپا ہے اور فیض الاسلام میں بھی۔ یہ صاحب بھی حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی طرح بھارت میں رہتے ہیں ــــ اور ان لوگوں کو کام کرنے کی ہدایت چونکہ اُدھر ہی سے ملتی ہے اور ہندوستان نے پاکستان کو کبھی تسلیم نہیں کیا، نہ وہ اسے قائم وسالم دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے ان کے اشارے پر یہ لوگ پاکستان میں کچھ اُن کے، کچھ اپنے مضمون، نظریہ پاکستان کے خلاف اور متحدہ قومیت کے حق میں چھاپ کر اقبالؒ و قائد اعظمؒ کو مطعون کرتے ہیں، سوادِ اعظم اہل سنت وجماعت کے خلاف بھی ان کی زبانیں اسی لیے کھلی ہیں اور اُن کا ہر اخبار، جریدہ اور شخص جمیع دسماسنیوں کو گالی دینے میں لگا ہوا ہے کہ سوادِ اعظم نے "آل انڈیا سنی کانفرنس" کے جھنڈے تلے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا اور قیام پاکستان کی جنگ لڑی تھی ــــ سو حکیم فضل الرحمٰن سواتی حکیم آمبور جنوبی ہند لکھتے ہیں "ترجمان حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم بڑے جوشیلے اور جذباتی آدمی تھے۔ جب کبھی اپنے نظریے کے خلاف کسی میں کوئی بات دیکھ لیتے تو فوراً جوش میں آکر

اس پر تنقید فرماتے ۔" (الرشید ۲۲۱ ۔ فیض الاسلام ۱۴۱)

یوسف سلیم چشتی اس سلسلے میں اقبال کو گالی دینے کا نیا انداز اپناتے ہیں "میرا دل نہیں مانتا کہ علامہ اقبال مرحوم اخلاقی اعتبار سے اتنے پست (فرومایہ) تھے کہ ایک مشہور و معروف عالم دین ۔۔۔ کے لیے ایسا ناروا لفظ استعمال کرتے ۔۔۔ دشنام طرازی شریفوں کا شیوہ نہیں "۔ (الرشید ۲۶۲، ۲۶۳) ــــ یہ یوسف سلیم چشتی شارح اقبال کی حیثیت سے بھی مال کما چکے ہیں کبھی کبھی اقبال کی خدمت میں "حاضری" کو بھی زندگی بھر فروخت کرتے رہے مگر اب یہ فیصلہ کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں کہ اقبال جیسے "غیر شریف" انسان کے پاس جانا ان کی بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی ۔ "علامہ اقبال کی خدمت میں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے مجھے بھی ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء قریباً ۱۳ سال تک حاضر ہونے کا موقع ملا " (الرشید ۲۶۲) ــــ ان حضرات نے اس "جرم کی پاداش" میں کہ حسین احمد دیوبندی کو اقبال نے مصطفیٰ کے قدموں تک پہنچنے کا مشورہ کیوں دیا، اقبال کی جوانی کی غلطیوں کی نشان دہی کرنا شروع کر دی ۔ اور کرنل عبد الرشید نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اسی وجہ سے انھوں نے لیڈی اقبال سے علیحدگی اختیار کی تھی اور "حقہ چھوڑنے سے پہلے کئی دوسری چیزیں چھوڑ دی ہوئی تھیں "۔ (فیض الاسلام ۱۳۵، ۱۳۶)

مولوی حامد میاں نے حسین احمد صاحب کی حمایت اور اقبال کی مخالفت میں کھل کر "متحدہ قومیت" کے تصور کو درست قرار دیا ہے، کہتے ہیں "ان (حسین احمد صاحب) کا علم دین، سیاسی اور تاریخی بصیرت ہندوستان میں اس اشتراک عمل کو درست قرار دے رہی تھی اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی بصیرت اور معلومات میں یورپ کی سیاست، تاریخ اور اس کے جدید نظریات بھی تھے ۔" (الرشید ص ۲۴۱) ــــ سُنیوں نے من حیث الجماعت تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا

اس لیے ان رسالوں میں بھی ان کے خلاف سیکڑوں صفحات لکھے گئے ہیں اور مسلم لیگ چونکہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کے حصول کی جدوجہد میں اہلِ اسلام کی وحدت کا نشان تھی، اس لیے اس کے خلاف بھی سب کچھ کہا گیا ہے۔ حسین احمد نجیب لکھتے ہیں "مسلم لیگ جو ہندوستانی عوام کی نظر میں انگریز کی پروردہ جاگیرداروں اور خطاب یافتہ سروں اور نوابوں پر مشتمل انگریزوں کی حلیف پارٹی شمار ہوتی تھی، اُمتِ مسلمہ کی قیادت علماء حق (؟) سے چھین کر مغرب زدگی کے شکار لیڈروں کے ہاتھوں میں تھما دینے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی" (الرشید ۱۶۰) ـــــ جی ہاں یہ سب کچھ پاکستان میں شائع ہو رہا ہے اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، کسی کو غیرت تک محسوس نہیں ہوتی کہ ہندوؤں کے اِن خانہ زاد غلاموں کو اس سے باز رکھا جائے۔ نظریۂ پاکستان کی حفاظت کے دعووں پر مشتمل بڑی خوبصورت تحریریں بڑے اچھے بیانات ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کانوں سے سنتے ہیں لیکن تحفظِ نظریۂ پاکستان کے دعوے داروں کو یہ کھلی تحریریں دکھائی نہیں دیتیں یا دکھائی نہیں جاتیں۔ ـــــ اسی مضمون میں لکھا ہے کہ پاکستان انگریزی ڈپلومیسی کا شاہکار ہے ـــــ "جب تحریکِ آزادی ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی تو انگریزی ڈپلومیسی نے قدیم فلسفہ پھر دہرایا اور برِصغیر کی مختلف نظریاتی جماعتوں کو باہم ٹکرا دینے کا منصوبہ بنایا" (۳۰۰)۔ حضرات! اس حقیقت کو مت بھول لیے کہ یہ پاکستان ہی کا ایک رسالہ ہے، اذکار اگرچہ بھارتی ہیں۔

بات چونکہ حسین احمد صاحب کے اس بھاشن کے گرد گھوم رہی ہے کہ اُنہوں نے اوطان سے قوموں کی "ساخت" کے بارے میں کیسے بات کی تھی۔ اس لیے ایک اور حوالہ بھی دیکھ لیجیے، جس سے یہ واضح ہو گا کہ اس بیان کی تاویلیں محض دھوکا دینے کے لیے کی جاتی ہیں ورنہ اس طبقے کے خیالات میں ذرہ برابر بھی

تبدیلی نہیں آئی۔ یہ پاکستان کے قیام کو غلط سمجھتے ہیں، بے بنیاد قرار دیتے ہیں، بے نتیجہ گردانتے ہیں۔ اور ان کا آج بھی یہی عقیدہ ہے کہ اسلام و سلام سب بے فائدہ ہے، قومیں تو اوطان ہی سے بنتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے، عزیز الحسن صدیقی غازی پوری کا مضمون "ایک مردِ مومن و حق پرست کی مثالی زندگی" کا ایک اقتباس

"حضرت شیخ الاسلام نے جب یہ فرمایا تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" (اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُن پر بہتان نہیں تھا، اُنہوں نے واقعی فرمایا تھا۔ محمود) تو اقبال مرحوم نے شدید تنقید ہی نہیں، ان کی تذلیل بھی کی تھی اور اس خیال کی تردید میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ کاش مرحوم آج حیات ہوتے اور اس نظریہ کی بنیاد پر (اپنے) پاکستان کے دستور کی تدوین کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو انہیں یقین آجاتا کہ شیخ وقت اور امام ہند کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ نقش بر آب یا باد رہوا نہیں تھے بلکہ ایک ایسی حقیقت تھے جس کو دنیا نے تسلیم کر لیا۔" (الجمعیتہ دہلی۔ ابوالکلام آزاد نمبر، ۴ دسمبر ۱۹۵۴ء۔ ص ۱۳۲)

یہ لوگ مختلف طریقوں سے پاکستان کا ایک حصہ الگ کر اچکے ہیں۔ اب چاہتے ہیں، ملک میں خانہ جنگی ہو جائے، کوئی ایک آدھ صوبہ الگ ہو جائے یا پاکستان کی سالمیت کو اور کوئی نقصان پہنچ جائے تاکہ یہ کہہ سکیں کہ دیکھا، ہمارے "شیخ الاسلام" صاحب نے جو پاکستان کی مخالفت کی تھی، وہ ٹھیک تھی۔ ہم اگر ہندو کے غلام ہوتے تو بہتر تھا۔

یہ لوگ جو محبوبِ کبریا علیہ التحیتہ والثناء کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نعوذ باللہ، وہ مر کر مٹی میں مل گئے ہیں، وہ کسی کا بھلا بُرا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ـــــ اپنے اپنی رسالوں میں حسین احمد صاحب کے بارے میں عقیدے کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ یوسف سلیم چشتی صاحب کہتے ہیں:

گردن نہ جھکی جس کی کسی شاہ کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے مُردوں میں پڑی جان (الرشید ۳۶۳)

علامہ اقبال نے "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کی گردان کرنے والے ان حضرات کو گاندھی کے چرنوں کے بجائے محمدؐ عربی کے قدموں میں آنے کی دعوت دی اور انہیں کہا کہ اسلام کو کفر کا تابع مہمل بنانے کی کوشش کرنے والو، تم مقامِ رسولِ پاک سے بے خبر ہو ——— اس پر شریف احمد طاہر کا استدلال ملاحظہ ہو "کیا مقامِ محمدؐ عربی سے بے خبر حافظ القرآن والاحادیث ہو سکتا ہے؟ اور اگر صحیحین کا محدث بھی مقامِ محمدؐ سے بے خبر رہتا ہے تو باخبر کون ہوتا ہے؟ اگر قال اللہ وقال الرسول کا درس دہندہ مقامِ محمدؐ عربی سے ناواقف ہے تو ———" (الرشید ۳۸۰) یعنی آپ قرآن وحدیث کا کچھ علم حاصل کر کے اگر خدا اور رسولؐ کے منکر ہو جائیں یا ان کے احکام کی صریح خلاف ورزی کریں اور اس پر افتخار کا اظہار کریں تو آپ سیدھے راستے پر ہیں ؟؟۔

اقبال کے خلاف ان رسالوں میں جو اشعار شائع کئے گئے ہیں، ان میں بھی ان لوگوں کی دریدہ دہنی انتہا کو پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ "مبیٔ جو شخص اپنے آپ کو مصطفیٰؐ تک نہیں پہنچاتا، اس کے ابولہب ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے مگر اقبال کو گالی دینے کا انداز ملاحظہ ہو۔ یہ دیکھیے کہ اسے کس کس جُرم پر "ابولہب" کہا جا رہا ہے۔ درج ذیل پہلا شعر اشرف علی تھانوی صاحب کے ایک مُرید، دارالعلوم دیوبند کے شیخ التفسیر، ڈابھیل کے شیخ الحدیث، ریاست ہائے متحدہ بلوچستان کے وزیرِ معارف شرعیہ اور جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے شیخ التفسیر ——— شمس الحق افغانی صاحب کا ہے:

نظامِ قوم بدو گونہ می شود پیدا
اگر ہنوز ندانی کمال بولہبی ست

اظہار الحق سہیل عباسی امروہوی "شانِ ابولہب" بیان کرتے ہیں:

بہر شنیدہ مدہ گوش پرس پرسان نیز
بہر شنیدہ زدن چانہ شانِ بولہبی ست (۳۷۸)

اقبال سہیل کی جو طویل نظم شاملِ اشاعت ہے، اس کا زور ملاحظہ ہو:

نظر نہ بودن و با دیدہ در در افتادن
دو گونہ شیوۂ بوجہلی و بولہبی ست (۳۳۶)

علامہ اقبال کا پیغام تھا کہ "بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست" مگر اس کے مقابلے میں اقبال سہیل کہتے ہیں "بگیر راہ حسین احمد ار خدا خواہی"۔
الرشید کے مدنی و اقبال نمبر میں شریف احمد طاہر نے علامہ اقبال کے تینوں شعروں کا تجزیہ کرنے کی جو سطحی اور عامیانہ کوشش کی ہے، وہ قارئین کے تفنن طبع کے لیے تین صفحوں پر شائع کی گئی ہے مگر ان صاحب کا مبلغ علم یہ ہے کہ وہ اسے رباعی قرار دیتے ہیں۔ "اقبال مرحوم کی وفات کے بعد "ارمغانِ حجاز" میں یہ رباعی کیوں چھپاں کر دی گئی"۔ اور "یہ رباعی فارسی میں ہے یا کہ اردو میں"۔ (۳۸۱)
آغا شورش کاشمیری نے ان تین شعروں کو چار شعر قرار دیا تھا۔ "آپ نے چار شعر کہے جو ہر کہ و مہ کی نوک زبان ہو گئے"۔ (چٹان ۲۰ اپریل ۱۹۵۹ء ص ۱۳)، "الارشاد" اٹک کے ایڈیٹر صاحب بھی اسے رباعی ہی سمجھتے ہیں (بحوالہ الرشید محرم ۱۳۹۱ھ) لیکن ان لوگوں کے ان رسالوں میں اقبال کے خلاف زبان کھولنے کے جو مظاہر ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ علامہ اقبال ہی کے کچھ شعر "اقبال بنام اقبال" کے عنوان سے شائع کیے گئے ہیں۔ مثلاً ـــ

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

اقبال بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

الرشید کے "مدنی و اقبال نمبر" کے آخر میں "لیڈرِ اعظم" کے عنوان سے "حضرت شاکر سیالکوٹی" کی ایک نظم اقبال کے خلاف ہے۔ جی ہاں سب اہلِ پاکستان کی غیرت کو چیلنج کے انداز میں ——

مذہبیت سے ہے لیڈر بے خبر   عشق ہے پتلون سے اور کوٹ سے
خبثِ تہذیب نوی ہے آشکار   حملے گو کرتے ہیں نوڈی ادسٹ سے
ظالمو! یہ عالموں پر پھبتیاں   بچنا دستِ بے صدا کی چوٹ سے

قارئین کرام! حسین احمد صاحب تو اسلام اور کفر کی جنگ میں اپنا کردار ادا کر چکے۔ اب ان کے متبعین ان کا دامن تھامے منافقت کی نقاب پہنے نظریۂ پاکستان پر چاروں طرف سے حملہ آور ہیں۔ وسائل کی بہتات ان کا مرکب ہے اور زبان و قلم کے ہتھیار دُکو وہ پاکستان، بانیٔ پاکستان، خالقِ تصورِ پاکستان اور غازیانِ تحریکِ پاکستان کے خلاف آزادانہ استعمال کر رہے ہیں۔ آپ عشقِ رسولِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی سپر بنا لیجئے، وطن کی محبت کے تیر و سنان سے مخالفین کی صفیں اُلٹ دیجئے، اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو ——

یادِ اقبال۔ گفتار سے کردار تک

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ملت کے ہر روگ کی تشخیص کی اور اس کا علاج تجویز کیا۔ اب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ شاعرِ اعظم تھے، عظیم فلسفی تھے، مفکر تھے، مؤرخ تھے۔ سب کچھ بجا مگر بنیادی طور پر وہ مبلغِ اسلام تھے۔ اُنہوں نے شعر و سخن کی وادی میں قدم رکھا ہے تو بھی ملت کی سربلندی اور سرفرازی کی بات کی ہے، فلسفے کی جزئیات پر گفتگو کی ہے یا خودی اور علم و عشق وغیرہ کے فلسفے کی تخلیق کی ہے تو اس کا مقصدِ وحید بھی یہ ہے کہ ہر مسلمان مردِ مومن بن جائے، وہ ہر باطل قوت سے مسلسل پیکار کو شعار بنا لے، وہ موت کے خوف کو دل سے محو کر دے اور اپنے آپ کو عشقِ مصطفیٰؐ کے لیے مختص کر لے۔ ان کی فکر خدا اور رسولؐ کے ارشادات کے تابع ہے، کہیں اس سے صرفِ نظر نہیں کرتی۔ اُنہوں نے اسلام کے عروج کی تاریخ بیان کی ہے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کے زوال پر اظہارِ افسوس نہیں کیا، انہیں سربلندی کی راہیں سمجھائی ہیں۔ وہ سالکِ راہِ فقر تھے۔ مفسرِ نکتۂ عشق تھے۔ وہ رحمتِ عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے عاشق تھے۔ اسی لیے جب ہم انہیں شاعر گردانتے ہیں تو وہ اس پر احتجاج کرتے ہیں اور اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم سے داد چاہتے ہیں۔

من اے میرِ اُمم ! داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمُردند

اقبال دین کا احیا و فروغ چاہتے تھے۔ اسی مقصد کی خاطر انہوں نے مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا تصوّر پیش کیا تھا۔ وہ صرف ایک خطۂ ارضی کے حصول کی بات نہیں کرتے تھے، اسے مثالی اسلامی ریاست دیکھنا چاہتے تھے، اسے اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے تمام جدید علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا، ان سمندروں میں غوّاصی کی تھی اور اس کے نتیجے کے طور پر اسلام کی حقانیت کو ہر جدید علم کے ذریعے، ہر ممکن طریقے سے ثابت کیا۔ اس راہ میں وہ اتنے ثابت قدم رہے کہ نہ ملّاؤں نے اُنہیں بخشا، نہ تہذیبِ مغرب کے پرستاروں نے ان کے خلاف محاذ قائم کرنے میں دقیقہ فرو گزاشت کیا۔ لیکن اس مردِ قلندر نے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کو اپنی زندگی کے ہر لمحے پر مسلط کر دیا اور بابانگِ دہل کہا:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

یہ علامہ اقبال کے نصب العین کی عظمت ہے کہ آج ابلہانِ مسجد سے تہذیب کے فرزندوں تک، اقبال کے مقام کو اپنی نگہ بہاں اور نو بیاں سنبھال کر دیکھتے ہیں، سب لوگ ان کے علوِ مرتبت کے قائل ہیں۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہم نے انفرادی یا اجتماعی کسی بھی حیثیت سے اس اقرار کا دائرہ گفتار سے کردار تک وسیع نہیں کیا۔ اقبال نے اسلام کے احیاء و نفاذ کے لیے ایک الگ مسلم ریاست کا تصور تخیل پیش کیا تھا۔ خداوند قدوس نے ہم پر کرم کیا، ۱۹۴۷ء میں ہمیں پاکستان کی شکل میں ایک

ملک دے دیا۔ مگر کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ ہم نے علامہ اقبال کی خواہش کو اس ملک میں عمل کی شکل کیوں نہیں دی۔ کچھ لوگ تو اس ملک کی بنیاد اور اساس ہی کے بارے میں ژاژ خائی اور ہرزہ سرائی کو شعار کیے بیٹھے ہیں اور باقی جو ہیں وہ منقار زیر پر ہیں۔ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ اس مملکت میں انفرادی یا اجتماعی طور پر اقبال کے فلسفۂ خودی کی کیا گت بنائی جا رہی ہے۔ قومی لحاظ سے ہم خوانِ استعمار کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں چوستے ہیں اور فرد کے طور پر ہم میں سے ہر ایک نے اپنی خودی، کسی نہ کسی کے پاس رہن رکھ دی ہے۔ خالقِ تصورِ پاکستان کے تصورات کو اس ملک کے رہنے والے کب تک مٹی میں ملائے رکھنے کو شعار بنائے رکھیں گے؟

اسلام کے بے باک مبلغ اقبالؒ نے ہمیں تعلیم دی کہ ہم اپنے دل و دماغ میں عقیدۂ توحید کو راسخ کر لیں۔

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما
رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

لیکن انھوں نے "اقرار باللسان" کے ساتھ "تصدیق بالقلب" پر زور دیا ہے یعنی اعمال میں توحید کو نافذ کرنے کو کہا ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

لیکن اگر ہم اقبال کے نام لیوا اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ توحید پر ہمارا ایمان زبانی ہے۔ اگر ہم دل سے توحید کے قائل ہوتے تو کیا ہمارے اعمال و افعال غلط ہو سکتے تھے۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے تو ہم کسی کا حق غصب کر سکتے ہیں؟ برائیوں کو زندگیوں پر نافذ کر سکتے ہیں؟ علامہ نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ:

تو عرب ہو یا عجم ہو، ترا لَآ اِلٰـهَ اِلَّا
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اقبال موحدِ خدا کی وحدانیت کو دل سے تسلیم کریں اور ہماری زندگیوں کا ہر لمحہ خود بولے کہ ہم موحد ہیں۔ یہ کیا کہ موحد کہلائیں اور خوف غیراللہ کا ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو، استمداد ہم حکام سے کرتے پھریں، روٹی ہم کارل مارکس کے پیروؤں سے طلب کریں، حاکمیتِ اعلیٰ خداوندِ تعالیٰ کے بجائے "عوام" کی مانیں۔ معاشرت اور تعلیم کے لیے رہنمائی خدا کے نظام کے بجائے کہیں اور سے مانگیں۔

علامہ اقبال نے اسلام کے واضح اور معیّن اصولوں پر چلتے ہوئی اپنی سوچ کا محور عشقِ مصطفیٰؐ کو قرار دیا ہے۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ جب بھی ذکر کرتے ہیں، عقیدت وارادت کی گہرائیوں سے کرتے ہیں۔

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

با خدا در پردہ گویم · با تو گویم آشکار
یا رسول اللہؐ او پنہان و تو پیدائے من

اقبال کے عشق کی پیروی کا ذکر آنے تو کیا ہم نے سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ کی محبت کو حرزِ جان بنایا ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ہم اقبال کا نام لیتے ہیں، ان کا ذکر کرتے ہیں، انہیں اپنا رہنما سمجھتے ہیں، مفکرِ اسلام خیال کرتے ہیں تو ان کی فکر، ان کی زندگی کے حاصل کو ہم نے کس حد تک درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔ پھر اگر زبانی ہم حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت وعقیدت کی بات

کہتے ہیں تو ہم نے ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کے لیے قربانیاں دینے کے مواقع پر اس محبت کی لاج رکھی ہے یا نہیں۔ اس ملک میں جب مرزائیوں کو اسمبلیوں کے ممبر منتخب کیا جارہا تھا تو کتنے اقبالی اور کتنے "عاشقِ رسول ؐ" اپنی جان و مال و آبرو کی قربانیاں دے کر اس راہ میں حائل ہوئے۔ علامہ اقبال نے تو کہا ہے:

"لا نبی بعدی" ز احسانِ خدا ست
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ ؐ است

ہم میں سے کچھ لوگوں نے خدا اور رسول ؐ کا آپس میں "جھگڑا" کرا رکھا ہے لیکن اقبال تو وہ کہتے ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ:

تو فرمودی، رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جُز تو مارا منزلے نیست

اُنہوں نے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا،

خراب جسارت آں رندِ پاکم
خدا را گفت "مارا مصطفیٰ ؐ بس"

علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی پر بحث و تمحیص کرنے والوں کے اعمال میں ان کے اس فلسفے کا پرتو کہاں کہاں ہے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

اُنھوں نے تو یہ تک فرما دیا۔

مُنکرِ حق نزدِ مُلّا کافر است
مُنکرِ خود نزدِ من کافر تراست

ہم میں سے کس کس کی علّامہ اقبال کے ان اشعار کی روح سے شناسائی ہے؟

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقرِ غیور"

وہ فقر کو تسخیرِ حیات سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فقر کی تاثیر سے مومن "مولا صفات" بن جاتا ہے۔

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ حیات
بندہ از تاثیرِ اُو مولا صفات

وہ دعا کرتے ہیں کہ مسلمان کو فقر کی تلوار عطا فرما دے۔

قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدِ جانباز ؓ ہے یا حیدرِ کرار ؓ

اور جب کوئی قوم فقر کی صفت سے متصف ہو جاتی ہے تو ہمیشہ سرفراز و سربلند رہتی ہے، سرنگوں ہو ہی نہیں سکتی۔

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

اسی تخصّص کے باعث فغفوری و خاقانی درویشی کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اور چونکہ فقر کا مقصد بے زری اور تہی دامانی نہیں ہے بلکہ یہ صفت کمالِ خودی سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ اگر تو صاحب سرمایہ ہے تو بھی فقر کی دولت کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

گرچہ باشی از خداوندانِ دِہ
فقر را از کف مدہ از کف مدہ

لیکن ہم اقبال کے نام پر تفریں منانے والوں میں سے کتنے ہیں، جو اس دولت سے بہرہ ور ہیں، جن کی درویشی سلطانی کو اپنے سامنے جھکاتی ہے اور جو مالدار ہوتے ہوئے بھی فقر سے بے نیاز نہیں ہیں۔

ہمارے کچھ دوست اشتراکیت کو اپنے دکھوں کا علاج کہتے ہیں، کچھ دوسرے اسلام سے اس کی پیوندکاری کرتے ہیں، اسلام کو ہر دکھ کا علاج سمجھنا ان کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ ان میں سے بہت سے دوست اقبال کی تقریبات کے منتظم ہوتے ہیں لیکن انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ علامہ نے اشتراکیت کے "باوا آدم" کارل مارکس کے متعلق کیا کہا تھا۔

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

اور "شکم" کے معاملات کی اقبال کے نزدیک کیا اصلیت ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟

جہاں تک عسرت زدوں، محتاجوں کی زندگی میں بہار لانے اور انہیں کھاتے پیتے لوگوں کے ہم پایہ سمجھنے اور بنانے کی بات ہے، یہ کام صرف اور صرف اسلام نے کیا ہے اور وہی کرسکتا ہے۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبین این است و بس

مساوات کی بات اسلام کے علاوہ کہیں کی جاتی ہے تو محض دھوکہ ہے جہاں غیر اسلامی نظاموں نے یہ نعرہ لگایا ہے، دنیا بھر میں اس کے برگ و بار دیکھ لیجیے۔ اسلام کا تو بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ:

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے ست
بوریا و مسند و دیبا یکے ست

اسلام کو صرف عبادات و عقائد تک محدود ایک "مذہب" سمجھنے والوں کو علامہ اقبال نے متنبہ کیا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ اس دینِ کامل و اکمل نے زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی رہنمائی کی ہے۔ اس میں عبادات و عقائد کے علاوہ حکومت، معیشت، معاشرت کے رہنما اصول پائے جاتے ہیں جن پر چل کر ہم جہاں آخرت کی کامرانیوں سے ہمکنار ہو سکتے ہیں، وہاں دنیا میں بھی ہر لحاظ سے مثالی زندگی گزار سکتے ہیں۔ صرف عبادات ہی اسلام نہیں۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسی لیے علامہ نے دین اور سیاست کی ہم آہنگی کے حق میں آواز بلند کی ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

"جمہوری تماشا" کی توضیح وتصریح اُنھوں نے مختلف مقامات پر کی ہے، کہا۔

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

"جمہوری تماشے" کی جزئیات پر یوں گفتگو کی ہے۔

الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے

غرض علامہ اقبال نے تو چاہا تھا کہ ہر مسلمان "مردِ مومن" بن جائے اور مردِ مومن ان کے نزدیک جرأت وشہامت اور استقلال واستقامت کی نشانی ہوتا ہے۔ وہ ظلم کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے مظلوم کا حامی ہے، وہ کلمۂ حق کہنے سے تختۂ دار پر بھی باز نہیں آتا۔ اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل اس کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید، تبسّم برلب اوست

وہ مومن کو چار عناصر سے مشتق بتاتے ہیں۔

قہاری و غفاری و قدوسی وجبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

وہ کہتے ہیں کہ مومن تقدیر کا پابند نہیں، وہ خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ جمادات و نباتات تقدیر کے پابند ہیں۔ مومن کی شان ہی یہ ہے کہ وہ اس قسم کی زنجیروں میں اسیر نہیں ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

تو پھر کیا ہم میں سے کوئی شخص مومن کی صفات رکھتا ہے اور ان عناصر سے اپنی

تشکیل و ترتیب محسوس کرتا ہے جو مومن کے لیے خاص ہیں، اپنے آپ کو احکامِ الٰہی کا پابند کرتا ہے تاکہ تقدیر اس کے تابع ہو۔

اقبال نے جواں مردوں کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ حق گو اور بے باک ہوتے ہیں، وہ خدا کے شیر ہوتے ہیں، روباہی صفات سے قطعاً عاری۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مگر ہم نے اپنے آپ میں جواں مردوں کی کوئی خوبی پیدا کرنے میں ہمیشہ تردد و تامل سے کام لیا ہے، ہم من حیث المجموع روباہ صفت ہوتے جا رہے ہیں حق گوئی اور بے باکی چند "سرپھروں" کی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور خود اس وادیٔ پُرخار میں داخل ہونے کو کارِ بے خیر جانتے ہیں۔

انہوں نے تمام مسائل کو ایک شعر میں حل کر دیا ہے کہ اگر ہمیں مسلمان بن کر زندہ رہنا ہے تو قرآن مجید ہمارے لیے مشعلِ راہ ہونا چاہیے ہمیں اپنے مسائل کا حل اسی میں تلاش کرنا ہوگا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

لیکن کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم نے قرآن کو سوائے قسم کھانے کے یا کسی قریب الموت شخص کی موت آسان کرنے یا زیادہ سے زیادہ ناظرہ یا حفظ پڑھ لینے کے ، اپنی زندگیوں پر کس طرح برتا ہے۔ کبھی ہمیں یہ خیال آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام علوم اس کتاب میں بیان فرمائے ہیں، ہم اس سے اکتسابِ فیض کریں۔ اس میں انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی گزارنے کے جو رہنما اصول بتائے ہیں، ہمیں ان کا علم ہو تاکہ ہم ان سے صرفِ نظر نہ کر سکیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ہم یہ کرلیں تو ایام کے مرکب

نہیں، راکب بن جائیں گے۔

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

قرآنِ مجید فرقانِ حمید نے جگہ جگہ مسلمانوں کو "تتفکروا" "تتدبروا" کہہ کر غور و فکر پر اُکسایا ہے۔ ریاضی، معاشیات، سائنس کے مختلف شعبوں اور دوسرے تمام علوم کی ترغیب قرآنِ حکیم اور احادیثِ مقدسہ سے ملتی ہے۔ خدا نے ہمیں جانوروں کی خلقت پر غور کرنے کو کہا ہے۔ آسمانوں کی بلندیوں کی پیمائش پر اُکسایا ہے، زمین کے مسطوح ہونے پر غور و فکر کی ترغیب دی ہے اور جبال کے نصب ہونے کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اقبال نے اپنے پیغام میں خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کی روشنی میں ہمیں کائنات کی تسخیر کی اہمیت کا احساس دلایا ہے اور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کی حیاتِ طیبہ سے استفادہ کرنے کی ہدایت کی ہے ـــــ فرمایا۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

مگر ہم معراجِ مصطفیٰ کے حوالے سے محبوبِ خدا علیہ التحیۃ والثنار کی بلندیٔ درجات کا ذکر تو کرتے ہیں، اس سے اپنے لیے کچھ سیکھنے کی خواہش ہی نہیں کرتے۔

علامہ اقبال علیہ الرحمہ شاعر کو قوم کا دیدۂ بینا قرار دیتے ہیں اور وضاحت کرتے ہیں کہ قوم کے ہر دکھ، درد اور مصیبت میں شاعر اسی طرح سب اعضائے جسم سے زیادہ اظہارِ درد کرتا ہے، جس طرح آنکھ کرتی ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

لیکن آج کل کے شاعر قوم کو مصائب و آلام میں گھرے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس پر

نگاہِ غلط انداز ڈال کر، اپنے "نان نفقے" کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے "سب اچھا" کی آوازیں بلند کرتے ہیں، قوم کی خوشحالی کے نادپھونکتے ہیں اور ظالم حکمرانوں کے دست و بازو بنتے ہیں۔

علامہ اقبال نے مغربی نظامِ تعلیم کی حقیقت کو ان لفظوں میں واضح کیا تھا:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

مگر ہم اسی کلیسائی نظامِ تعلیم کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں اسی سے اپنی نسلوں کو آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ بس اتنا کرتے ہیں کہ کبھی اس کے لیے لندن والوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور پھر "انقلاب" آتا ہے تو امریکہ والوں سے استفادہ شروع کر دیتے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ ہمارے ملکی حالات کیا ہیں، ہماری احتیاجات کا دائرہ کیا ہے اور اختیارات و وسائل کیا ہیں۔

حالانکہ ہمیں تو اپنے بچوں کو اچھا مسلمان اور اچھا پاکستانی بنانا تھا۔ ہمیں ان علوم سے اپنی نئی پود کو آگاہ کرنا چاہیے تھا جن کے حصول کے بعد ہمارے اسلاف نے سائنس اور علم کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز انکشافات کیے، ایجادیں کیں۔

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

اقبال کو دکھ ہے کہ ان علوم سے، ان تصانیف سے یورپ نے بہت کچھ حاصل کیا اور ہم اپنے بچوں کو صرف یہ بتاتے ہیں کہ راجر بیکن ہی سائنس کا "باوا آدم" ہے۔ حالانکہ خود یہ عظیم سائنسدان اپنی کتابوں میں مسلمان سائنس دانوں کے علوِ فکر کا ذکر کرتا ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ اس نے عرب سائنس دانوں سے استفادہ کیا ہے۔ کیا ہم اپنے بچوں کو اس حقیقت کی ہوا تک لگنے دیتے ہیں کہ ابن الہیثم کی طبیعات میں،

جابر ابن حیان کی علم کیمیا میں، بو علی سینا کی قانون میں، الخوارزمی کی الجبرا میں، نصیرالدین اور بہاء الدین کی ریاضی میں، محمد البتانی اور ابوالوفا۔ کی علوم مثلثات میں، جابر بن الفلاح کی علم ہیئت میں، عمر خیام کی نجوم اور حساب میں، رازی کی علم الامراض میں ابوالعباس فرغانی، البطروجی اور الزرقانی کی فلکیات میں منفرد حیثیت ہے۔ ان عظیم سائنس دانوں مفکروں اور مصنفوں نے کئی علوم سے لوگوں کو پہلی دفعہ روشناس کرایا۔ نئے نظریے پیش کیے، جن پر آج تک سائنس کی ساری عمارت کھڑی ہے۔ کیا ہم اپنے طالبعلموں کو بتاتے ہیں کہ الجبرا ہمارا علم ہے، جس کا نام تک مغرب نہیں بدل سکا۔ صفر کو عربوں نے پہلی دفعہ رواج دیا۔ ہندسے مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ آنکھ کے پردے پر اشیا کے انعکاس کا نظریہ ہمارا ہے۔ چیچک اور خسرے کا علاج ہم نے دریافت کیا۔ ستاروں اور زمین کی حرکت محوری کو ہم نے ثابت کیا۔ گھڑی، عینک، قطب نما، اصطرلاب (ستاروں کی بلندی معلوم کرنے والا آلہ) غرض سیکڑوں چیزیں اہلِ اسلام نے ایجاد کیں۔ مگر ہم تو اقبال کو صرف اچھا کہتے ہیں، ان کے افکار کا ذکر کرتے ہیں، صرف ان کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور ان کے فکر و فلسفہ پر مصنفانہ موشگافیاں کر سکتے ہیں۔ ان کو اور ان کے افکار و نظریات کو، ان کی تعلیمات وارشادات کو اپنے عمل سے بہر حال دور رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلاف کی خوبیوں کے معترف تھے اور ہم میں وہ خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے مگر ہم اسلاف کی خوبیوں کا علم حاصل کرنے کی اہمیت سے بھی آگاہ ہونے کی خواہش نہیں رکھتے۔

اقبال اس تعلیم کے قطعاً مخالف تھے جو مسلمان بچے کو اسلام سے بیگانہ کر دے اور الحاد کی منزلوں تک پہنچا دے۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اور ہم ہیں کہ تعلیم کے ذریعے اسلام سے دوری ہمارا مطمحِ نظر معلوم ہوتا ہے۔
انہوں نے ہمیں ان "مدرسوں" کی اصلیت سے آگاہ کیا تھا، جن کی "عظمت" مغربی
نظامِ تعلیم کے برگ و بار کی حیثیت سے ہمارے ذہنوں میں رچائی بسائی جا رہی ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"

مگر ہمیں شاید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے سروکار ہی نہیں رہا۔ ہم علومِ مغرب
کی سند جبینوں پر لٹکاتے ہی کو کلاہِ افتخار سمجھنے لگے ہیں۔ اقبال کی سوچ کو ہم میں سے
کس کس نے اپنے نہاں خانۂ دماغ میں گھسنے دیا ہے؟؟
اقبال نے نسل، قوم اور رنگ کے تفاوت کو "سرمایہ داری" کی معزلوں میں
شمار کیا ہے اور اس افیون سے ہمیں بچانے کے لیے وہ ساری عمر کوشاں رہے۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

انہوں نے نسل و رنگ و خون کے بتوں کی اسی انداز میں شکست کی خواہش
کی جس طرح سرکارِ دو عالم فخرِ موجودات سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی، نہ افغانی

انہوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ قرآنِ حکیم نے شعوب و قبائل تو محض پہچان
کے لیے بنائے ہیں، کسی کے لیے ان سے متعلق ہونا سرمایۂ افتخار یا وجہِ ذلت
نہیں۔ انہوں نے ہمیں یاد دلایا کہ ہمیں اپنے آبا کے نام و نسب پر مفتخر ہونے کی کوشش
نہیں کرنی چاہیے بلکہ تقویٰ کی راہ میں گامزن ہونا چاہیے کہ "اِنَّ اَکْرَمَکُم

عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے مسلمان ہونے پر فخر کر سکتے ہیں، پرہیز گاری جن کا تخصص ہے، وہ نسل و وطن کے گنبدوں میں محصور نہیں ہیں —— ؟

اقبال نے عورت کے ذکر میں کہا تھا۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اقبال زندگی کے سوزِ دروں کی بات کرتے تھے، ہم ان کی بات کو سازوں پر گاتے ہیں۔ انہوں نے خاتون کو تصویرِ کائنات کا رنگ و روغن قرار دیا تھا، ہم اسے عریاں اور نیم عریاں تصویروں میں پیش کرتے ہیں یعنی؛

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ہم اقبال کو پڑھتے اور سنتے تو ہیں سمجھتے اور برتتے نہیں ہیں۔

علامہ اقبال نے صرف کتابی علم ہی حاصل نہیں کیا تھا، مغرب میں رہ کر وہاں کی تہذیب و معاشرت کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا اور ہمیں اس کی مضرتوں سے بچانے کی سعی کی۔

نگہ کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اُنہوں نے کہا؛

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہو گا

اب تہذیبِ مغرب خود اپنی اس بے بضاعتی پر نالاں ہے۔ اب امریکہ میں تھوڑی دیر کے لیے بجلی بند ہو جاتی ہے تو تہذیبِ مغرب کے اصلی خدوخال فوراً سامنے آ جاتے ہیں۔ اس مہذب اور متمدن ملک میں دکانوں سے لے کر عصمتوں تک سب کچھ اس قلیل عرصے میں لٹ جاتا ہے اور تہذیب اس پر سربلندی و سرفرازی کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اب خود اہلِ یورپ کو اپنی تہذیب کے انجام و عواقب سے خوف آنے لگا ہے۔ اب کنواری ماؤں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو یا مادر پدر آزادی کے دوسرے برگ و بار، اس پر وہاں بھی پریشانی اور اضطراب کا اظہار ہو رہا ہے اور مذہب کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اقبال نے شاخِ نازک پر بنے ہوئے اس آشیانے کی ناپائیداری کی جو پیش گوئی کی تھی، اس کے حرف بحرف پورا ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے مگر ہم اقبال کی مسلسل نشان دہی کے باوجود اس زرِ کم عیار کو کھرا سونا سمجھ رہے ہیں۔ مغرب میں تجربے کے بعد جس چیز سے وہاں کے باسی پریشان ہیں اور اس سے جان چھڑانے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں، ہم کیوں اپنے قومی رہنما، فلسفی شاعر اور مفکر ادیب کی باتوں کو کانوں سے دل تک اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ اہلِ مغرب کے حال سے عبرت کیوں نہیں حاصل کرتے، مشاہدے ہی سے اس تہذیب کے اثرات بد کے بارے میں یقین کیوں نہیں کر لیتے اور خود اس کثافت کو اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگیوں پر استعمال کرنے کی حماقت کیوں کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال نے سیاستِ افرنگ کی ابلیس پروری سے لوگوں کو متنبہ کیا اور اسے خداوندِ قدوس کی حریف قرار دیا تھا۔

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دوصد ہزار ابلیس

مگر ہم نے سیاستِ افرنگ کو اپنی سیاسی اور قومی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ اقبال نے افرنگیوں کی زبوں کاریوں اور شعبدہ بازیوں کا مختلف مقامات پر ذکر کیا اور ہمیں ان کے سحر و طلسم سے محفوظ رکھنا چاہا کہ :

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ در آستینِ او نگر
از فریبِ او اگر خواہی اماں
اشترانش را ز حوضِ خود براں

مگر ہمارے لیے اقبال اگر لائقِ تعظیم ہیں تو اس سے کہیں زیادہ افرنگ سے درآمد کی ہوئی ہر چیز قابلِ پرستش ہے۔ اگر ہمارا عمل درست ہے تو اقبال غلط راہ کے راہی ہوں گے۔ ان کا ذکر چھوڑیئے۔ اور اگر ان کی بات غلط نہیں تو خدا کے لیے اپنے عمل کی سمت راست کیجئے۔ ہم اقبال کا نام بھی لیتے ہیں، ان کے پیغام کا ذکر بھی کرتے ہیں، ان کو حکیم الامت بھی تسلیم کرتے ہیں، انہیں شاعرِ مشرق بھی کہتے ہیں، انہیں ملت کا ناصح بھی مانتے ہیں مگر تہذیبِ حاضر کی چکا چوند نے ہماری آنکھوں کو یوں خیرہ کیا ہے کہ ہمیں اپنے آقا و مولا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کم ہو رہی ہے، آپ کی سیرتِ پاک کی تقلید اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے تتبع سے

ہم نظریں چرا رہے ہیں۔ ہمارے دلوں میں مومن کامل بننے کی اُمنگیں نہیں ہیں۔ ہم اسلام کو اپنی زندگیوں پر نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ جھوٹ سے ہمیں نفرت نہیں ہے، دوسروں کا مال ہم غصب کرلیتے ہیں، سمگلنگ اور چور بازاری کے ذریعے حرام ہم کماتے ہیں، ملاوٹ وغیرہ کے ذریعے قتلِ عمد کے مرتکب ہم ہوتے ہیں، جس مملکت کو اسلام کے معمل کے طور پر ایک مثالی ریاست بننا تھا، ہم اس میں عملی لحاظ سے اسلام کو ثانوی سے بھی زیادہ دور کی حیثیت دے چکے ہیں۔ افراد اور جماعتیں قومی اور ملّی سوچ سے عاری ہوتے جارہے ہیں۔ ہم اپنے محسنوں کو یا تو یاد نہیں کرتے، اگر یاد کرتے ہیں تو زبانی جمع خرچ سے کام نکال لیتے ہیں۔ اعمال کو اس یاد سے "آلودہ" نہیں ہونے دیتے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

ان کی یہ غزل طبلے سارنگیوں کے سامنے گا کر جھومنے ہی پر اکتفا نہ کیجیے۔ سوچیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں ——— ؟؟

471

عزمِ صمیم اور عملِ پیہم کا پیکر

پاکستان کا قیام قائدِ اعظمؒ کی زبردست قوتِ ارادی، انتھک محنت وجانفشانی، بے پناہ خلوص اور خداداد ذہنی صلاحیتوں کا مرہونِ منت ہے۔ ان خوبیوں کی بدولت اہلِ اسلام میں انہیں جتنی ہر دلعزیزی ملی، اس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملے گی۔

محمد علی جناح اس عظیم المرتبت شخصیت کا نام ہے، جس نے ایک مایوس شکست خوردہ، غلام اور پست ہمت قوم کو اس قابل بنایا کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر باعزت زندگی بسر کر سکے۔ انہوں نے اپنی قابلیت، سیاست اور اخلاص سے برصغیر کی سیاست کا رُخ پلٹ کر رکھ دیا۔

مسلمان ہندوستان میں اپنی محکومیت پر قناعت کیے بیٹھے تھے اور افلاس اور پس ماندگی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایسے میں قائد انگریزوں، ہندوؤں، سکھوں اور مارِ آستین مسلمانوں کے مشترکہ محاذ پر چومکھی لڑتے رہے اور اپنے پیروؤں کو نئی راہ، نئی منزل دکھاتے ہوئے آزادی تک پہنچایا۔

تخیلِ پاکستان کے خالق علامہ اقبالؒ اور بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظمؒ آزادی کے بارے میں ایک سے خیالات رکھتے تھے۔ اس بارے میں دونوں کے نظریات اقبال کی زبان میں یہ تھے۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات (ضربِ کلیم)

"قائد کے تدبر و حکمت کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے "ہندو مسلم اتحاد" کے دام ہم رنگِ زمین کی اصلیت کو مسلمانوں پر واضح کر دیا، ہندوؤں کی دغابازی اور انگریزوں کی سیاست کا مقابلہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ برِصغیر میں اگر تحریکِ آزادی ہندو کانگرس کے زیرِ اثر کامیاب ہوئی تو مسلمان رام راجیہ کا غلام بن کر رہ جائے گا۔ اس لیے انہوں نے اپنے عزم و تدبر سے ہندوؤں کی سازشوں اور عیارانہ چالوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ ان کی زندگی میں ہزاروں خطرناک موڑ اور دقیق مسائل سامنے آئے مگر انہوں نے ان کو فہم و فراست، عقل و علم اور دانش و حکمت سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھایا۔ قائدِ اعظم کی آواز نے برِصغیر کے خدا پرست انسان کو اس کے بلند مقام سے آگاہ کیا، اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جگایا، ان میں جذبۂ خود اعتمادی پیدا کیا اور اس شیرازے کو اکٹھا کر کے دنیا کے سامنے ایک وحدت ــــــ ناقابلِ تسخیر وحدت کی شکل میں پیش کیا۔ انہوں نے اپنی

بلند ہمتی، انتھک محنت، بے مثال جُرأت اور عزم و استقلال کے ذریعے ایک عظیم مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اُنہوں نے دس کروڑ ہندی مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نکالا اور ہندوؤں کی عیّاری سے آزاد کرایا۔

قائدِ اعظم کوئی فاتح یا کشور کشا نہیں تھے اُنہوں نے شہر نہیں فتح کئے، میدان جنگ میں سپہ سالاری کے جوہر نہیں دکھائے لیکن ان کی فتح مندیوں پر ملّتِ اسلامیہ ہمیشہ فخر کرے گی۔ قائد کے فیضِ تربیت سے مسلمانوں کو خود آگہی کی دولت نصیب ہوئی، ان کی انگلیاں ہمیشہ قوم کی نبض پر رہیں، وہ مسلمانوں کے مسائل اور اسلام کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اُن میں دوسروں کو متاثر کرنے کا جوہر بھی تھا اور بے خوفی، جرأت اور حق گوئی کے کمالات بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ اُنہوں نے گاندھی کے چہرے سے شانتی اور اہنسا کے نقاب ہٹا کر برہمنی سامراج کو اپنی اصلی صورت میں دنیا کو دکھا دیا۔

بابائے قوم اپنے خلوص، عزم مصمّم اور عمل پیہم سے زندگی کے تمام ادوار میں کامیاب ہوتے۔ اُنہوں نے ہر مہم کو خلوص کے ساتھ شروع کیا اور ہر جائز طریق سے اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی سعی کی۔ اس راہ میں نہ طعن و تشنیع کی پرواکی، نہ تعریف و تحسین کی خواہش۔ اُنہوں نے مختلف قوموں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے سلسلے میں بھی تگ و دو کی اور اسلام کے احیا و نفاذ کی خاطر مسلمانوں کو ایک علیحدہ مملکت دلوا کر دم لیا۔

انگریز سمجھتا تھا، اس کا واسطہ ہندو کانگرس سے ہے اور کانگرس کے ہندو اپنے زعمِ باطل میں برصغیر پر حکومت کرنے اور مسلمانوں کو محکوم رکھنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں انگریزوں اور ہندوؤں کے طلسم باطل کو توڑنے والے محمد علی جناحؒ تھے۔ اُنہوں نے اعلائے کلمۃ الحق سے ان دونوں قوموں کو چونکا دیا اور وقت

سے منوایا کہ برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کی طاقت سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں اور یہاں کے مستقبل کا فیصلہ اہلِ اسلام کی مرضی اور خواہش کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

دنیا ہندوستان کو ایک متحدہ قومیت کا وطن سمجھتی تھی۔ کچھ لوگوں نے اسلام کا نام لے کر یہ فتویٰ دیا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ لیکن قائد کی بصیرت اُن کے ثبات نے دنیا پر واضح کر دیا کہ یہاں بالکل مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ قومیں بستی ہیں، ہندو اور مسلم۔ اور یہ کہ اب مسلمان "متحدہ قومیت" کے دھوکے میں نہیں آسکتے کہ ساری عمر کے لیے ہندو کی غلامی قبول کرلیں۔ بانیٔ پاکستان جانتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ مملکت کے حصول کے بغیر ہندوستان میں اسلام کا مستقبل روشن نہیں ہوگا۔ ہندوستان کے مہاجن اپنے بے پناہ مالی وسائل کے ساتھ مسلمانوں کے اس موقف کے خلاف نبرد آزما تھے۔ کانگرس کے علاوہ مسلمانوں کے علماء کی ایک جماعت بھی قائدِ اعظم اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے خلاف سرگرمِ عمل تھی۔ مگر وہ بات کے دھنی تھے اور ان کی بات حق و صداقت کی آئینہ دار تھی۔ ان کو جمہور کی بے پناہ قوت کا احساس تھا اور اُنھوں نے اس قوت سے پورا پورا کام لے کر برطانوی اور بھارتی سامراج سے مسلمانوں کو نجات دلائی۔ وہ اگر ملتِ اسلامیہ کی آزادی کے لیے کوشاں تھے تو مسلمان بھی ان پر جانیں نچھاور کرتے تھے۔ باہمی خود اعتمادی کی اس فضا نے ہمیں ۱۹۴۷ء میں منزلِ مقصود پر پہنچایا۔

قائدِ اعظم نظم و ضبط کے پاسدار تھے، وقت کے قدر دان تھے، قانون کا احترام کرتے ہوئے سب کچھ کہہ دیتے تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا، مبالغہ آمیزی کو پسند نہیں کرتے تھے، حقیقت پسند آدمی تھے۔ بعض سیاستدان معمولی معمولی ترغیب و تحریص پر قومی اور اجتماعی مفاد کو پسِ پُشت ڈال دیتے تھے لیکن اس مردِ درویش کا سیاسی کردار ہمیشہ بے داغ رہا۔ اُنھوں نے ملی مقاصد کی راہ میں آنے والے ہر روڑے کو پاسکے

استحقار سے ٹھکرایا اور عزت کی تاریخ میں ایک نئے باب کی نیو ڈالی۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلم عوام پر قائدِ اعظم کی گفتگو کے ایک ایک فقرے اور لفظ کا اثر ہوتا تھا۔ اسی لیے بعض مخالف و معاندان کو ڈکٹیٹر کہتے رہے مگر تاریخ کا کوئی تاریک ترین گوشہ بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اُنھوں نے کبھی من مانی کارروائی کی ہو۔ ان کی زندگی میں سستی شہرت حاصل کرنے کی خواہش نے کبھی سر نہیں اُبھارا۔ وہ عوام کی رائے کا احترام کرتے تھے لیکن سستی واہ وا کرنے والوں کو اُنھوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔

ان کی فراست، راست گوئی، عالی حوصلگی اور خود اعتمادی کی مثالیں دیکھ کر ان کی عظمت کا اندازہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ان خوبیوں کی بدولت یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب ایسا انسان قوم کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے تو اس قوم کی تقدیر بدل کے رہتی ہے، وہ اپنے عزائم میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

قائدِ اعظم ایک راست باز اور بلند کردار انسان تھے۔ اُنھوں نے کبھی اپنے الفاظ و خیالات کو ابہام کا نشانہ نہیں بننے دیا — اپنی قوم کو ان پر اور انھیں قوم پر اعتماد تھا اور اس دُہرے اعتماد نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی شکل اختیار کر لی۔

بانیٔ پاکستان بچپن ہی سے نہایت ذی فہم اور سنجیدہ تھے، کھیل کود میں وقت گنوانے کے بجائے مطالعے میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ وہ کبرسنی تک کردی کمان کے تیر کی طرح رہے۔ ان کے ارادوں کی طرح ان کی کمر بھی خم نہیں آیا۔ دراصل وہ جھکنا جانتے ہی نہ تھے۔ جامہ زیبی کا یہ عالم تھا کہ جو بھی لباس پہنا، پھب گیا۔ بیضوی چہرہ، گوری رنگت، تیکھے نقوش، کشادہ پیشانی اور آنکھیں ایسی کہ ایک مصور کو بھی کہنا پڑا، قائدِ اعظم کی آنکھیں بنانا بہت مشکل ہے۔ ان کے اندر ایک ایسا عمق

اور گہرائی ہے، جس کی تھاہ موئے قلم کی گرفت سے باہر ہے۔"

نومبر ۱۹۴۹ء میں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح نے قائدِ اعظم کے متعلق ایک خصوصی انٹرویو میں بتایا کہ قائدِ اعظم عوام کی نظر میں سنجیدہ انسان، متین سیاستدان اور ایک مدبر کی حیثیت سے نمایاں ہوتے، اپنی گھریلو زندگی میں وہ بڑے ہشاش بشاش رہتے تھے، انتہائی نرم دل آدمی تھے۔ اپنی والدہ مرحومہ سے انہیں بڑی محبت تھی۔ جب وہ پاکستان کے گورنر جنرل ہوئے تو دو کھانوں سے زیادہ اُن کی میز پر کبھی نظر نہیں آئے۔ فرماتے تھے کہ میرے لاکھوں ہم وطنوں کو ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہ آئے تو مجھے طرح طرح کے کھانے کہاں زیب دیتے ہیں۔ مادرِ ملت نے فرمایا کہ قائد کی گھریلو زندگی میں بھی ایک خاص ضابطہ ہوا کرتا تھا۔

چودھری محمد علی (سابق وزیرِ اعظم پاکستان) بابائے قوم کی شخصیت کے متعلق ذاتی مشاہدات کی روشنی میں لکھتے ہیں؛

"قائدِ اعظم محمد علی جناح بڑی حد تک گاندھی جی کی عین ضد تھے، لباس اور طور اطوار میں کسی ہر دلعزیز عوامی لیڈر سے دُور کی مشابہت بھی نہ رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو کبھی ایک مذہبی آدمی ظاہر نہ کیا، خود نمائی اور مذہبی جذبات سے منافقانہ طور پر کام لینے کے سخت مخالف تھے۔ ان کی دیانت شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ مناصب اُن کا دل لبھا سکتے تھے، نہ خوشامد انہیں بگاڑ سکتی تھی۔ وہ صاف اور ایچ پیچ سے خالی سیدھی سادی زبان استعمال کرتے تھے، جس سے گہری چھان بین کے بعد بھی کوئی دوسرا مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا۔"

(ظہورِ پاکستان)

اہل کانگرس مسلم لیگ کے قیام ہی سے اس پر حکومتِ برطانیہ کے تابع مہمل ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ جنگِ آزادی کے حصول کے لیے صرف

کانگرس نے قربانیاں دی ہیں اور وہی انگریز کے مخالف تھے ——— اس سلسلے میں میں اپنی کھدر پوشی اور قائدِ اعظم کے سوٹ کو بھی نشانۂ استہزا بنایا جاتا رہا اور یہ بھی کہا گیا کہ انگریزوں نے کانگرس کے جہادِ آزادی سے ڈر کر مسلم لیگ کو خود جنم دیا تھا تاکہ اس جنگ کو سبوتاژ کیا جا سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کو گالی دینے والے مسلمانوں اور مسلم لیگ کی قوت سے خائف ہو کر برطانیہ سے داد خواہ ہوتے ہیں۔ جنگِ آزادی کے بزعم خود دھرا تما انگریز کی تعریف میں رطب اللساں ہوتے ہیں اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم سے ڈر کر بدیشیوں سے استمداد کرتے ہیں۔

عام طور سے مسلم لیگ کے بارے میں اس کے دشمن کہتے رہے کہ یہ خان بہادروں، جاگیرداروں، نوابوں اور "سروں" کی جماعت تھی مگر اس حقیقت سے کون صرفِ نظر کر سکتا ہے کہ کانگرس پر بھی بڑے بڑے سیٹھ، تعلق دار اور لکھ پتی پارسی چھائے ہوئے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس کا بانی ایک انگریز تھا ——— قائدِ اعظم بھی کانگرس میں رہے، اُنہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز وہیں سے کیا۔ لیکن اس کی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت نظر آتی رہی اور انہیں ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں سے ہمیشہ یہ خدشہ رہا کہ مسلمان کانگرس میں شامل ہو کر اپنی جداگانہ حیثیت باقی نہ رکھ سکیں گے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر انہوں نے بلا پس و پیش اس کی رکنیت قبول کر لی۔

۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم عمل میں آئی تو ہندوؤں نے اس کی شدید مخالفت کی اور ایک طوفان کھڑا دیا۔ چنانچہ حکومت نے بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی۔ اس صورتِ حال میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی اور مسلمانوں کے حقوق کی جد و جہد کی بات شروع ہوئی۔

مئی، ۱۹۳۰ء میں کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو نے کانپور میں تقریر کرتے ہوئے

اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو سیاسی طاقتیں ہیں، ایک برطانوی حکومت اور دوسری کانگرس۔ اکتوبر، ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کے آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجتماع میں قائد اعظم نے خطبۂ صدارت دیتے ہوئے نہرو کے اس اعلان کا منہ توڑ جواب دیا۔ اس اجلاس میں دو قومی نظریے کا ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ:

"ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی تہذیب و ثقافت ان کی روایات و اقدار ہندو قوم سے بالکل مختلف ہیں۔"

بانیٔ پاکستان نے ۱۹۴۰ء میں ایک انگریزی جریدے میں ایک مضمون لکھا، جس میں کہا:

"ہمیں اس ملک کے لیئے ایک ایسا قانون وضع کرنا چاہیے جو اس حقیقت پر مبنی ہو کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں اور جن کی رو سے دونوں قومیں اپنے مشترک وطن کی حکومت میں برابر کی شریک اور حصے دار ہوں"۔
(ٹائم اینڈ ٹائیڈ۔ لندن۔ ۹، مارچ ۱۹۴۰ء)

۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس ہوا، جس میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی۔ قائد اعظم نے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"اگر برطانوی حکومت واقعی یہ چاہتی ہے کہ اس ملک کے باشندے خوشحال ہوں تو سب کے لیے یہ راہِ عمل مناسب ہے کہ اس ملک کی دو بڑی قوموں کو الگ الگ وطن مہیا کر دیے جائیں اور ملک کو قومیتوں کی بنا پر خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔"

قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد ۲۵، دسمبر ۱۹۴۰ء کو قائد نے اپنے ۶۴ ویں یوم ولادت پر قوم کو خطاب کیا:

"اب ہمیں دنیا کو ثابت کر دکھانا ہے کہ ہم میں حکومت کرنے کی صلاحیت ہے اور یہ کہ ہم لاہور ریزولیوشن کے الفاظ کی روشنی میں اپنا مطمح نظر حاصل کرنے پر قادر ہیں۔"

ہندو کانگرس میں راج گوپال اچاریہ نے پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا۔ قائداعظم عوام کو جنگ آزادی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ ایسے میں حیدر آباد دکن میں ۱۵ جنوری ۱۹۴۵ء کو قائداعظم نے کہا:

"مسلمانانِ ہند منظم ہیں اور اسی سرزمین میں ان کو وہ عزت اور وقار حاصل ہے، جو آج سے دو صدیاں پیشتر حاصل تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت اب ہمیں حصولِ پاکستان سے نہیں روک سکتی۔ میں مطمئن ہوں کہ ہم دوسروں کے اندازے سے پیشتر کامیاب ہوں گے۔"

قائدِ اعظم نے قراردادِ پاکستان منظور ہوتے ہی پاکستان کے بارے میں اپنے یقین کا اظہار شروع کر دیا تھا اور قیام پاکستان تک مختلف بیانات میں پورے اعتماد سے مسلمانوں کی مملکت کا تذکرہ کرتے رہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو آپ نے فرمایا:

"میرا یقین ہے کہ پاکستان ہماری مٹھی میں ہے۔ یہ پہلے ہی وجود میں آچکا ہے اور ہم اپنے صوبوں یعنی سندھ، بلوچستان، سرحد، پنجاب، بنگال اور آسام میں حصولِ اقتدار میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

جب کہ ان کے مقابلے میں ہندوؤں کو نوشتۂ دیوار نظر نہیں آتا تھا۔ وہ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے، قائداعظمؒ کے خلاف ژاژ خائی میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ تقسیم ہند کے تاریخی اعلان کی تاریخ ۳ جون ۱۹۴۷ء سے ۱۵ دن پیشتر ۱۸ مئی کو سردار ولبھ بھائی پٹیل کا یہ بیان تمام اخبارات میں چھپا:

" اس ملک کے جو مسلمان اب تک پاکستان کا خواب دیکھ رہے ہیں،

وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں"۔

پتا نہیں، یہ سردار پٹیل کی غلط فہمی تھی یا دھوکہ دہی کی کوئی صورت۔

عبوری حکومت میں شرکت کے مسئلے پر بھی ہر قدم پر بابائے قوم کی سیاسی بصیرت آشکار ہوتی ہے کیبینٹ مشن نے برطانوی حکومت کی طرف سے جو پلان پیش کیا تھا، مسلم لیگ نے اس کی منظوری دے دی کیونکہ اس میں مسلم اکثریتی صوبوں کی گروپنگ اور صوبوں کی مرکز سے علیحدگی کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا۔ کانگرس نے منصوبے پر اعتراضات اور شرائط کے ساتھ منظوری کی بات کی، لیکن عبوری حکومت میں شرکت کو اس لیے منظور نہیں کیا کہ مسلم لیگ اور کانگرس کی نیابتی مساوات اس کے نزدیک قابلِ قبول نہیں تھی۔ پھر نیا فارمولا وضع ہوا، جس میں کانگرس کو چھ، مسلم لیگ کو پانچ اور اقلیتوں کو دو نشستیں مل رہی تھیں، قائدِ اعظم نے اسے بھی منظور کر لیا لیکن کانگرس نے اپنی نشستوں میں سے ایک نشست کانگرسی مسلمانوں کو دینا چاہی۔ اس پر قائد نے اصرار کیا کہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے مسلم نمائندوں کے انتخاب کا حق صرف مسلم لیگ کو ہے ——— اس پر ۱۶ جون ۱۹۴۶ء کو حکومت برطانیہ نے کچھ لوگوں کے نام عبوری حکومت کے لیے تجویز کیے۔ اس طرح پارٹیوں کے بجائے افراد کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ اس لیے یہ پیش کش بھی مسترد ہو گئی۔

پنڈت جواہر لعل نہرو نے کانگرس کا صدر منتخب ہونے کے بعد ۱۰ جولائی ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن پلان کے خلاف تقریر کی۔ چنانچہ قائدِ اعظم نے بھی ۲۷ جولائی کو مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں صورتِ حال کی وضاحت کی اور مسلم لیگ نے ۶ جون کو دہلی میں دی گئی منظوری واپس لے کر قیامِ پاکستان کے مطالبے کی توثیق کر دی اور حصولِ پاکستان کے لیے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ اس پر کانگرس نے واویلا کیا کہ مسلم لیگ نے منظوری واپس لے لی ہے لہٰذا اہلیں حکومت دو ۔ ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو کانگرس نے عبوری حکومت

کے ارکان کی حیثیت ——— سنبھال لی۔ اس روز مسلمانوں نے ملک بھر میں سیاہ جھنڈے لہرا کر احتجاج کیا۔ اس سے قبل ۱۶ اگست کو مسلمانوں کے "یوم راست اقدام" پر ہندوؤں نے ان پر حملے کیے تھے ——— پھر بات چیت ہوئی اور ایک نیا فارمولا بنا جسے گاندھی جی نے مان لیا لیکن نہرو نے مسترد کر دیا۔ گاندھی کے اس فارمولے پر دستخط قائدِ اعظم کی بہت بڑی فتح تھی کہ اس میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد با اختیار نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ قائداعظم کی لارڈ ویول سے بات چیت جاری تھی۔ حسین شہید سہروردی بھی پہلے کلکتہ میں اور پھر دہلی آ کر وائسرائے سے ملے اور وائسرائے نے مسلم لیگ کو پانچ نشستوں کی پیش کش کی تو قائداعظم نے لیاقت علی خاں، سردار عبدالرّب نشتر، راجہ غضنفر علی خان، آئی آئی چندریگر کے ساتھ پانچویں نشست انتہائی سیاسی فراست سے جوگندر ناتھ منڈل کو دے دی۔ کانگرس نے مسلم لیگ کو وزارتِ خزانہ دینی چاہی کہ ان کے نزدیک مسلمان اس کے اہل نہیں تھے۔ لیکن قائداعظم کی بصیرت نے اسے قبول کر لیا اور چودھری محمد علی اور ڈاکٹر ضیاءالدین کی معاونت نے اس وزارت کو یوں نبھایا کہ کانگرس چیخ اُٹھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی تصنیف "انڈیا ونز فریڈم" میں اس بات کو کانگرس کی سب سے بڑی غلطی قرار دیا ہے۔

قائدِاعظمؒ کے سیاسی عمل کی ایک اور واضح فتح مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ تحریک ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو لاہور سے شروع ہوئی۔ پھر سارے پنجاب اور بعد ازاں صوبہ سرحد میں پھیل گئی۔ انگریزوں نے صوبائی خودمختاری کے مسئلے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی تشکیل سے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ جن صوبوں میں مسلم اکثریت ہے، وہاں بھی مسلم لیگی حکومتیں قائم نہیں ہونے دی جائیں گی۔ چنانچہ انہوں نے آبادی سے زیادہ نمائندگی کا سوال خود خوشامدی مسلمانوں سے اٹھوایا۔ اس ایکٹ کے تحت اقلیتوں کی نشستیں ان کی آبادی کے مقابلے میں بہت

زیادہ تھیں۔ لہٰذا پنجاب میں ۸۰ فی صد نشستوں پر قابض ہونے کے باوجود مسلم لیگ یہاں حکومت نہ بنا سکی۔ گورنر نے صرف بیس رکنی یونینسٹ پارٹی کے سربراہ ملک خضر حیات ٹوانہ کو حکومت بنانے کی دعوت دی جنہوں نے کانگرس کے تعاون سے حکومت بنالی۔ خضر حکومت نے مسلم نیشنل گارڈ کو ایک غیر قانونی جماعت قرار دے دیا اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا تو سارے صوبے میں آگ سی لگ گئی اور قانون کی خلاف ورزی کی بہت بڑی عوامی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کے دوران میں پانچ لاکھ سے زائد لوگ جیلوں میں گئے ــــــ آخر مسلم نیشنل گارڈز پر سے پابندی ہٹانے کا اعلان کیا گیا لیکن دفعہ ۱۴۴ کے تحت شہری آزادی پر پابندی بحال رہی۔ چنانچہ تحریک ختم نہ ہو سکی ــــــ پنجاب میں امن کے امکانات سے مایوس ہو کر خضر حیات حکومت نے مسلم لیگی لیڈروں سے گفت و شنید کی جس کے نتیجے میں ایک سمجھوتے کے تحت حکومت نے سارے نظر بند رہا کر دیے، جلسوں، جلوسوں کی اجازت دے دی اور پبلک سیفٹی ایکٹ کے بجائے دوسری سیاسی پارٹیوں سے مشورے کے بعد نیا مسودۂ قانون تیار کرنے کا وعدہ کیا گیا ــــــ یوں صوبے میں امن تو بحال ہو گیا مگر خضر حکومت کو ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو مستعفی ہونا پڑا۔ اس طرح انگریز کے کاسہ لیسوں کی ایک جماعت یونینسٹ پارٹی کا خاتمہ ہو گیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑے لیڈروں کے کردار میں بُعد المشرقین دکھائی دیتا ہے۔ مغربی دنیا میں گاندھی جی کی شہرت ان کے مخصوص کردار کے باعث ہوئی، جس میں ہر دے کی آواز، عدم تشدد اور عدم تعاون کے تماشے ظاہر ہیں کہ اہم ہیں۔ ایک بیرسٹر کا ننگ دھڑنگ سادھو بن جانا دنیا بھر کے لیے ایک عجوبہ ہے مگر قائداعظم نے کبھی ایسے ڈھونگ نہیں رچائے۔ ان کی کامیابی اور عظمت کا راز ان کی صداقت، حق پرستی اور خود اعتمادی میں مضمر ہے۔

مسٹر گاندھی برصغیر کے سب سے چالاک اور شاطر سیاستدان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے بڑا اہم اور نازک ہے۔ چنانچہ جونہی انگریز نے خلافت عثمانیہ پر ہاتھ ڈالا، مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔ گاندھی نے انہیں ترکِ موالات پر اُکسایا۔ مسلمان اس سازش کا شکار ہو گئے۔ مسلمان وکیلوں نے اپنی سندیں پھاڑ دیں، مسلمانوں نے سرکاری ملازمتوں سے استعفٰی دے دیے، اپنی جائیداد کوڑیوں کے مول بیچ دی اور ہجرت کا پروگرام بنالیا ——— ایسے میں ہندو ملازمتوں، وکالتوں اور دیگر کاموں کو سنبھالتے گئے۔ مسلمانوں کی جائدادیں اُنہوں نے کوڑیوں کے مول خرید لیں۔ اس وقت ہندوؤں کے ساتھیوں کو چھوڑ کر، سیاسی و ملی شعور رکھنے والے مسلمانوں نے اپنے طور پر اس تحریک کے مضمرات سے قوم کو آگاہ کیا۔ مثلاً مولانا احمد رضا خاں بریلوی؟ نے کہا:

"اگر سب مسلمان زمینداریاں، تجارتیں نوکریاں تمام تعلقات یکسر چھوڑ دیں تو کیا تمہارے جگری خیرخواہ جملہ ہندو بھی ایسا ہی کریں گے؟ اور تمہاری طرح ننگے بھوکے رہ جائیں گے؟ حاشا، ہرگز نہیں، زنہار نہیں۔"

(فاضل بریلوی اور ترکِ موالات از پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد مطبوعہ مرکزی مجلس رضا لاہور)

قائداعظم کی دوربین نگاہیں بھی ہندو کی اس چال کو پہچان رہی تھیں، چنانچہ نہ صرف وہ اس تحریک سے الگ رہے بلکہ اس کی مخالفت کی اور ایک تقریر میں کہا:

"انہوں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے، وہ قوم کو تباہی کے گڑھے میں گرا دے گا۔ کونسلوں کا مقاطعہ، سکولوں کالجوں کا مقاطعہ، برطانوی مال کا مقاطعہ یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ میری رائے میں کونسلوں کا مقاطعہ کرنے کے بجائے وہاں جاکر حکومت کا مقابلہ کرنا چاہیے۔"

مسٹر گاندھی "ہندو مسلم اتحاد" اور "عدم تشدّد" کے تمام تر اعلانات کے باوصف حقیقت میں سخت متعصّب ہندو تھے۔ وہ برِصغیر کے علاوہ افغانستان پر بھی ہندو تمدّن کے احیاء اور ہندو اقتدار کے خواب دیکھتے تھے۔ ان کے تین بڑے مشن تھے۔ اوّلاً ایک متّحدہ ہندوستانی قوم کا وجود ثابت کرنا، ثانیاً عدم تشدّد اور ثالثاً کھادی کا استعمال اور بدیشی مال کا مقاطعہ۔ وہ ساری عمر متحدہ قومیّت کی اشاعت و فروغ کے لیے کوشاں رہے اور مسلمانوں کے تشخّص کو ختم کر کے انہیں ہندوؤں کی اکثریت میں ضم کرنے کا خواب دیکھتے رہے مگر قائدِ اعظم نے اپنی بصیرت سے اس سارے تانے بانے کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ دنیا نے دیکھا کہ متّحدہ قومیّت کی بلند بانگی صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی اور مسلمان انفرادیت کا سورج نصف النہار پر جا پہنچا۔ اسی بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ لفظاً گاندھی جی جس فلسفے کے پرچارک رہے، ہندوؤں نے عملاً اس کے خلاف ہر میدان میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی اور "ہندو مسلم اتحاد" کے الفاظ کو پریشان کر کے رکھ دیا جب کہ قائدِ اعظم کی مسلم تشخّص و تخصّص کی بات صرف ان کی زبان پر نہیں تھی، ہندوستان کے ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں ہو گئی تھی۔ اگرچہ ہمارے کچھ علماء گاندھی کے سحر سے نہ نکل سکے اور آخر وقت تک قوموں کو اوطان سے مشتق بتلاتے رہے۔

گاندھی کی عدمِ تشدّد کی بات بھی صرف بات ہی رہی۔ ان معنوں میں کہ مسلمانوں کا خون ہندوؤں نے بہر حال روا رکھا اور اس قتلِ عام کے ہوتے ہوئے بھی "پرمو دھرما" کی بات میں معنوی خوبیوں کو تلاش کرنا بے سود ہے۔

پھر گاندھی جی نے کانگرس کے بڑے دھرماتماؤں کو کھدر پہنا دیا تو کیا اس سے ان کے دل بدل گئے اور غریب کی محبت ان کے دلوں میں جگہ پا سکی؟ حالات و واقعات ثابت کرتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے جیل جانے اور کھدر پہننے کو حب الوطنی

قرار دیا۔ اور سیاست میں معقولیت کے بجائے ہنگامہ پروری اور سٹنٹ بازی کو رواج دیا۔ اس کے برعکس قائداعظم محمد علی جناح نے ہمیشہ جامہ زیبی کو شعار کیے رکھا اور "لنگوٹی پوشی" کو محض دھوکہ سمجھا۔ نہ انہوں نے بھوک ہڑتالیں کیں، نہ مرن بھرت رکھے، نہ سوٹ بوٹ چھوڑا لیکن خدا کے فضل سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اصل میں قائداعظمؒ صاف، سیدھے اور کھرے آدمی تھے۔ ان کے نزدیک تصنّع کی کوئی اہمیت نہ تھی اور جو کچھ تھے، وہی دکھائی دیتے تھے —— یہی وجہ ہے کہ زندگی میں کامرانیوں نے ان کے قدم چومے۔

چوہدری سردار محمد خاں عزیز کہتے ہیں :

"گاندھی جی نے اپنے انگریز فرماں رواؤں سے سب سے بڑی حکمت عملی جو سیکھی، وہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا نسخہ تھی۔ اور گاندھی جی حقیقتاً انگریزی حکمت عملی کا مکمل نمونہ تھے۔ گاندھی جی نے بھارت ورش میں رام راجیہ کے قیام کی خاطر مسلمانوں کے قلب و جگر پر چھری چلائی۔ گاندھی جی نے اپنی ساری توجہات اس نقطے پر مرکوز رکھیں کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی امتیازی حیثیت کو ان کی نظر سے اوجھل کر دیا جائے۔"

(حیات قائد اعظم)

اور حالات نے ثابت کر دیا کہ قائداعظم نے گاندھی جی کو اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

انگلستان کا ایک صحافی بیورلی نکلس ۱۹۴۲ء میں ہندوستان آیا۔ ابتدا میں کانگرس کے نقطۂ نظر کا حامی تھا۔ مگر قائداعظم سے ملاقات کے بعد اتنا متاثر ہوا کہ اپنی کتاب "ورڈکٹ آن انڈیا" میں کہتا ہے :

"میں نے مسٹر جناح کو ایشیا کی اہم ترین شخصیت کہا ہے۔ بہت ممکن

عرصے میں ہندوستان کا مسئلہ دنیا کا نازک ترین مسئلہ بن جائے گا۔ اور یہی
مسٹر جناح دورِ انقلاب کے ہیرو ثابت ہوں گے۔ ہندوستان کے
دس کروڑ مسلمان ان کے ادنیٰ اشارے پر ہر قربانی دینے کو تیار ہیں اور
یہ وہ مقام ہے۔ جو اُن کے علاوہ اس ملک میں کسی کو حاصل نہیں۔ آپ
دیکھیے کہ اس مونوکل (یک چشمی عینک) اور ریشمی سوٹ والے شخص
کے ہاتھ میں کس طرح ایک عالم ہے۔"

(فیصلۂ ہندوستان، ترجمہ عبدالقدوس ہاشمی)

بانیٔ پاکستان کی فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری ضرب المثل ہے۔ وہ
رات بھر کام میں لگے رہتے حتیٰ کہ مرض الموت میں بھی کام کو اوّلیت اور اہمیت دی۔
ان کے سیکرٹری کا کہنا ہے کہ مجھے دیکھتے تو فرماتے:

"اگر کوئی سرکاری کاغذات آئے ہیں تو یہیں لے آؤ۔"

ایک دفعہ دستخط کرتے کرتے نڈھال ہو گئے۔ ان کی اس حالت کے پیشِ نظر
سیکرٹری ان کے کمرے میں جانے سے گریز کرنے لگے کہ انہیں دیکھ کر کہیں قائد کو کوئی
سرکاری کام نہ یاد آجائے۔ وہ فرمایا کرتے تھے جس قوم میں وقت کی پابندی کا احساس
نہ ہو، وہ دنیا میں سرفراز نہیں ہو سکتی۔ وہ مقررہ وقت کے علاوہ کسی ملاقاتی سے نہیں
ملتے تھے۔ ان کے معمولات میں ایک لمحے کا فرق نہیں آتا تھا۔

اتحاد اور یقین محکم کے ساتھ نظم و ضبط کا ان کا دعویٰ زبانی نہیں تھا بلکہ ان کی
فطرت کا جز تھا۔ ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ ہجوم جوشِ عقیدت
سے بے قابو ہو گیا۔ قائداعظم ہوائی جہاز کے دروازے تک آئے مگر بدنظمی دیکھ کر
واپس اندر چلے گئے اور فرمایا:

"میں ایک مہذب قوم کا سربراہ بننا چاہتا ہوں۔ جب تک یہ بدنظمی

ختم نہ ہوگی، جہاز سے نہ اُتروں گا۔"

قائد کی بصیرت، حق گوئی اور جرأت کے اِس واقعے کے چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) راوی ہیں کہ ابھی اس سوال کا فیصلہ باقی تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کی دونوں حکومتوں کا ایک گورنر جنرل ہوگا یا دو۔ موئنٹ بیٹن چاہتا تھا کہ وہ ۱۵ اگست کے بعد بھی آٹھ نو ماہ تک دونوں حکومتوں کا گورنر جنرل رہے۔ کانگرس نے یہ تجویز منظور کر لی اور نہرو نے اسے لکھا:

" ہمیں اس تجویز سے اتفاق ہے کہ عبوری دور کے لیے دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل ایک ہو۔۔۔۔۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، آپ اس منصب پر فائز رہیں اور اپنے مشورے اور تجربے سے ہماری مدد کریں تو ہمیں خوشی ہوگی۔"

چودھری محمد علی کہتے ہیں:

" جون کے آخر میں ہمیں پتا چلا کہ مسٹر محمد علی جناح نے خود گورنر جنرل بننے اور لیاقت علی خاں کو وزیر اعظم بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔ اس پر موئنٹ بیٹن کے جذبات اس قدر شدید تھے کہ اس نے ایک روز وائسرائے ہاؤس میں داخل ہوتے ہی قائد اعظم پر دلائل، پُرجوش التجاؤں اور دھمکیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ قائد اعظم نے اس کے نابڑ توڑ حملے بڑے وقار اور صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیے اور جواب میں بس اتنا کہا کہ "اِس فیصلے کے پیچھے کوئی شخصی محرک کارفرما نہیں۔ بلکہ اپنی قوم کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے یہ مثبت قدم اُٹھایا ہے۔"

(ظہورِ پاکستان)

یہ بے خوفی اور دلیری مسلم لیگ کے رہنما ہی کی نہیں تھی، محمد علی جناح کی گھٹی میں داخل تھی۔ بمبئی کا گورنر لارڈ ولنگڈن اپنے جبر و استبداد کے لیے تاریخ میں خاصا بدنام ہے۔ اس نے یکم جنوری ۱۹۱۸ء کو بمبئی ٹاؤن ہال میں "ہوم رول لیگ" کے متعلق تلخ و ترش لہجے میں کہا:

"یہ لوگ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے ملک میں انتشار پیدا کر رہے ہیں۔
اس جماعت کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ حکومت کے کام میں دشواریاں
پیدا کی جائیں اور اسے خوفزدہ کیا جائے"۔

ان دنوں کانگرس کے بعد "ہوم رول لیگ" ہندوستان کی سب سے بڑی با اثر اور طاقتور جماعت تھی اور محمد علی جناح اس کے بے باک رہنما تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جواباً کہا:

"ہز ایکسی لنسی نے لیگ کے متعلق جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان سے
مجھے سخت صدمہ پہنچا ہے اور میں ان کے ادب و احترام کے باوجود
ان کے طرزِ گفتگو پر سخت احتجاج کرتا ہوں"۔

تقریر کے آخر میں اُنہوں نے کہا:

"آپ نے ہمارے خلوص پر بد اعتمادی کر کے ہوم رول لیگ کی توہین
کی ہے اور میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا"۔

قائد یہ نعرۂ حق لگا کر سٹیج سے نیچے اُتر آئے۔

پاکستان کے پہلے وزیرِ قانون مسٹر جوگندر ناتھ منڈل قائد کے تدبر اور قانونی بصیرت کے متعلق کہتے ہیں کہ میں نے قائدِ اعظم کے ارشاد پر اپنی تمام قابلیت اور اہلیت صرف کر کے ایک مسوّدۂ قانون مرتب کیا۔ قائد نے اس کے تین چار صفحے غور سے پڑھے اور اسے "مسترد کاغذات" میں رکھ کر میرا شکریہ ادا کیا۔ تیسرے دن اُن کی

طرف سے مجھے ایک لفافے میں میرے مسودۂ قانون کے ساتھ قائد کے سٹینوگرافر کا ٹائپ کردہ ایک مسودۂ قانون ملا اور مجھے خود تسلیم کرنا پڑا کہ میرا مسودۂ قانون ان کے مسودے کے مقابلے میں کہیں ہیچ تھا۔

بدقسمتی سے ہم نے قائداعظم کے ارشادات کو حرزِ جاں نہ بنایا۔ ان کے متعین کردہ راستے پر چلنے میں کوتاہی دکھائی۔ انہوں نے مختلف شعبوں میں پاکستان کی سرفرازی کے لیے جو اصول مقرر کیے تھے، وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے ورنہ ہم ملک اور ملّت کے حوالے سے پریشانیوں اور پریشان حالیوں کا شکار نہ ہوتے۔

کیا آج کسی شخص کو اس حقیقت کا ادراک ہے کہ قائداعظم اپنی علالت کے باوجود مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر ڈھاکہ جاتے ہیں۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو تین لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میں آپ پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو کے سوا اور کوئی نہیں ہوگی۔ جو کوئی آپ کو گمراہ کرنا چاہتا ہے وہ دراصل پاکستان کا دشمن ہے۔ کوئی قوم ایک سرکاری زبان کے بغیر مخصوص طور پر متحد رہ کر کام نہیں کر سکتی۔ آپ دوسرے ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے، وہ اردو ہونی چاہیے۔"

عام طور سے اسلام اور اسلامیانِ ہند کے مخالف و معاند لوگ قائداعظم کی اسلام کے متعلق واجبی تعلیم کا ذکر کے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہے کچھ نہیں "کافرِ اعظم" کہہ کر فتویٰ تراشی میں نیا ریکارڈ قائم کیا۔ لیکن قائداعظم نے راک لینڈ کے سرکاری مہمان خانے میں طلبا اور نوجوانوں سے نواب بہادر یار جنگ کی موجودگی میں جو گفتگو کی، اس میں جب ان سے مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم

کے متعلق سوال کیا گیا تو اُنہوں نے کہا:

"جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سُنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے عام محاورے کے مطابق میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبتوں اور روابط کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ مُلا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور اسلامی قوانین کے مطالعے کی اپنے تئیں کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں اسلامی زندگی سے متعلق ہدایات کے باب میں زندگی کے روحانی پہلو، معاشرت، سیاست، معیشت سب کے متعلق رہنمائی ہے۔ غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں، جو قرآن مجید کی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔ قرآن کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہیں بلکہ اسلامی سلطنت میں غیر مسلموں کے لیے بھی سلوک اور آئینی حقوق کا اس سے بہتر تصور ممکن نہیں۔"

(صدق لکھنؤ۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۴۱ء)

بابائے قوم نے کئی طاقتوں سے مسلسل لڑائی کے نتیجے میں ہمیں پاکستان لے کر دیا۔ ہم کبھی کبھی ان کے اس احسان کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن کیا یہ بھی سوچتے ہیں کہ جو ملک اُنہوں نے بڑی محنت، تدبّر اور فراست سے حاصل کیا اس کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں ہم پر کیا ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ہم اپنے اعمال و افعال سے اپنے ملک کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہے۔ قائداعظم نے مسلمانوں کی اجتماعی قوت سے کام لیا تھا تو انگریزوں، ہندوؤں اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے مقابلے میں کامیاب

ہوئے تھے، ہم قائد کے نام لیوا اپنی اجتماعی قوت کو کس کام میں لا رہے ہیں، ہماری سوچ انفرادی تو نہیں ہو کر رہ گئی؟ قائدِ اعظم کے معتمد سیاستیں میں علامہ اقبال، لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر، فضل الحق، خواجہ ناظم الدین اور محترمہ فاطمہ جناح ایسے نام ہمارے ذہنوں سے محو تو نہیں ہو گئے؟ ہمیں یاد ہے کہ علماء و مشائخ میں پیر جماعت علی شاہ علی پوری، مولانا شبیر احمد عثمانی، پیر صاحب مانکی شریف، سیال شریف، بھرچونڈی شریف، احمد سعید کاظمی، عبدالحامد بدایونی.... وغیرہ قائدِ اعظم کے ساتھی تھے، پاکستان کے حامی تھے، ہم بھول تو نہیں گئے کہ وہ لوگ قائد کے مخالف تھے، جو پاکستان کو پلیدستان کہتے تھے جن کے لیے گاندھی کے چرنوں میں بیٹھنا اپنے لیے توشۂ آخرت تھا یا وہ اس جنگ میں "غیر جانبدار" تھے۔

کیا قائدِ اعظم کی سیرت ہمیں یہ سبق نہیں دیتی کہ ظاہر و باطن میں بُعد ناکامی کی دلیل ہے اور انسان جو کچھ ہو، وہی ظاہر کرے تو کامرانیاں اس کے قدم چومتی ہیں، دنیا اس کے سامنے سر جھکاتی ہے اور وقت اس کے آگے سپر ڈال دیتا ہے۔

قائدِ اعظم نے ہمیں آزادی دلائی، آزادی سے محبت سکھائی۔ کیا آزادی کو سنبھال کر رکھنا ہماری ذمّے داری نہیں ہے؟ کیا ہمیں اب تک یہ یقین نہیں ہوا کہ اگر ہم ذات کے لیے کچھ حاصل کرنے کی تگ و دو میں اجتماعی حیثیت سے کچھ گنوا بیٹھے تو یہ گھاٹے کا سودا ہو گا۔ اگر ہم ذاتی، حزبی اور محدود مفادات کی خاطر ملکی مفاد کو تج دینے کی پالیسی پر گامزن رہے تو تباہی ہمارا مقدر بن جائے گی۔

قائدِ اعظمؒ

مسلمانوں کی کشتی کے کھویا قائدِ اعظم
سیاست دان ہیں دنیا میں یکتا قائدِ اعظم

ہٹا سکتی نہ تھی طاقت زمانے کی انہیں اس سے
کیا کرتے تھے جب کوئی ارادہ قائدِ اعظم

ہمارے رہنما تھے، دُھن کے پکّے قول کے سچے
اور اُترے اپنے ہر وعدے پہ پورا قائدِ اعظم

شرافت تھی حیات اُن کی، فراست تھا شعار اُن کا
نہ دیتے تھے، نہ کھا سکتے تھے دھوکا قائدِ اعظم

نبھانے کے لیے جاں بھی لگا دیتے تھے داؤ پر
جو کرتے تھے کسی سے کوئی وعدہ قائدِ اعظم

جو اِک ساتھی نہ ہو، میدان سے پھر بھی نہ ہٹتے تھے
جو سو دشمن بھی ہوں، لڑتے تھے تنہا قائدِ اعظم

حیات اُن کی زمانے بھر پہ اے محمودؔ روشن ہے
تھے اپنی ہر خصوصیت میں یکتا قائدِ اعظم

(راجا رشید محمود)

قائدِ اعظمؒ

مسلمانوں کے تشخص کے محافظ

اسلام دینِ فطرت ہے، مذاہبِ باطلہ سے اس کی کوئی بات نہیں ملتی۔ اس میں خدا کی وحدانیت کسی بات سے مشروط نہیں ہے۔ اس میں رسولؐ نہ خدا کا بیٹا ہے نہ اپنے جیسا بشر۔ اس میں ترکِ دنیا کی ترغیب نہیں دی گئی لیکن دین کو دنیا کی بنیاد بنایا گیا ہے، یہاں تزکیۂ نفس کی اہمیت ہے، رہبانیت کی نہیں۔ یہاں دین محض چند رسوم یا عبادات و عقائد تک محدود نہیں ہے، زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ اس میں اگر خدا کی عبادت اور رسولِ خدا سے محبت اہم ہے تو معاشرت و معیشت، حکومت و سیاست غرض زندگی کے ہر پہلو سے رہنما اصول لوگوں کو بتا دیے گئے ہیں۔ ہماری تہذیب و تمدن دوسرے کسی بھی مذہب و مسلک سے مختلف ہے۔ مسلمان کفار سے الگ خصوصیات کے مالک ہیں اور اسلام کے آغاز ہی سے دشمن طاقتیں اس کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ مسلمانوں کا تشخص پہلے دن سے غیر مسلموں کی آنکھ میں کھٹکتا ہے، وہ اسے ختم کرنے کے لیے اپنی سی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اسلام اور کفر کی تاریخی آویزش نے برصغیر میں اسی وقت اپنے قدم جما لیے جب

یہاں پہلا آدمی مسلمان ہوا۔ وہ پہلا مسلمان کفار سے بالکل مختلف خیالات اور عمل کا آدمی تھا۔ اُس نے گفتار و کردار میں کسی اور کی غلامی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو یہ کوئی نیا نظریہ نہیں تھا، کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ مسلمان ہر لحاظ سے غیر مسلموں سے اپنا الگ تشخص رکھتا تھا اور اسی انفرادیت کے سہارے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ قائداعظم اور مسلم لیگ نے اسی بنیاد پر الگ مملکت کا تصور پیش کیا، جس میں اسلامی نظام حیات جاری ہو۔ یہ انگریز دوستی نہیں تھی اور نہ ہی معاشی احتیاج کا مسئلہ تھا بلکہ اس پہلو نے تو ہمارے اصل موقف کو تقویت دی کہ ہم مسلمان الگ قوم ہیں اور اپنی منفرد حیثیت میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انگریز نے ہندو سے کبھی خوف محسوس نہیں کیا۔ ہندوؤں نے بھی مختلف اوقات میں انگریز کی ہمدردیاں جیتنے میں مسلمانوں کو ہدفِ انتقام بنوایا اور خود بچ گئے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو پھانسی دی گئی، مسلمان جزائر انڈیمان اور دیگر مقامات پر محبوس ہوئے ان کی املاک کو تباہ کر دیا گیا۔ علامہ فضلِ حق خیر آبادی، مولانا کفایت علی کافی، مفتی صدر الدین آزردہ، احمد اللہ مدراسی اور نہ جانے کتنی شخصیتوں نے جنگِ آزادی میں اپنی خدمات کے "صلے" انگریزوں سے پائے۔ ہندوؤں نے ایسے میں سیاست سے کام لیا اور مراعات کے حصول میں لگے رہے۔ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات میں قربانیاں مسلمان دے رہے تھے اور ہندو اُن مسلمانوں کی جائیدادوں کو کوڑیوں کے مول خرید رہے تھے۔ جن ملازمتوں سے مسلمان استعفیٰ دیتے تھے، ہندو وہاں قبضہ جما لیتے تھے۔ مسلمان یہ سب کچھ آزادی کے لیے کر رہے تھے کیونکہ ہندو کے نزدیک آزادی حاصل کرنے کا مقصد مسلمانوں پر حکومت کرنا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھیوں کا کیا ذکر کہ انہیں تو سارا اسلام گاندھی جی کے چرنوں میں نظر آتا تھا، سیاسی اور ملی شعور رکھنے والے مسلمانوں نے اپنے طور پر عامۃ المسلمین کو ہندوؤں کی

اصلیت سے آگاہ کیا۔ مثلاً اعلیحضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ نے کہا:

"اگر سب مسلمان زمینداریاں، تجارتیں، نوکریاں تمام تعلقات یکسر چھوڑ دیں، تو کیا تمہارے جگری خیر خواہ ہنود بھی ایسا ہی کریں گے؟ اور تمہاری طرح بھوکے ننگے رہ جائیں گے؟ حاشا، ہرگز نہیں، زنہار نہیں"

(فاضلِ بریلوی اور ترکِ موالات از پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد)

ہندو نے اپنی ساری "انگریز دشمنی" کے باوجود اور "ہندو مسلم اتحاد" کے تمام تر نعروں کے باوصف مسلمانوں کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انہوں نے مختلف موقعوں پر مسلمانوں کی انفرادیت کے جواب میں انگریز پر اعتماد کا اظہار کیا۔

ماضی کی ساری تاریخ سے قطع نظر تحریکِ آزادی میں ہندو لیڈروں کے متذکرہ بالا ارشادات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں مسلمانوں کے تشخص کی بات ہو، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق "الکفر ملۃ واحدۃ" کافر مسلمانوں کے مقابلے میں متحد ہوتے ہیں اور ماضی کے چودہ سو سال اس بات پر شاہد ہیں کہ اسلام کے مقابلے میں کفر کی تمام طاقتیں متحد رہیں۔ پھر یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ انگریز مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کی بات کی حمایت کرتا ہو یا اس نے خود مسلم لیگ کی زبان میں یہ بات ڈال دی ہو۔

انگریز بھی "پاکستان" کو اسلام کے احیاء و نفاذ کی اساس سمجھتا تھا۔ مسلم لیگ نے عوام کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ "پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ"۔ ہندو بھی یہ جان چکا تھا کہ پاکستان کا مطلب "اسلامستان" ہے اور خود قائد اعظم نے مختلف موقعوں پر اسلام کی خوبیاں گنواتے ہوئے اپنے تشخص کی بات کی اور مسلمانوں کے مذہب، ان کی معاشرت و معیشت اور ان کے تمدن کی حفاظت اور فروغ کے لیے الگ ملک حاصل کرنے کی جد و جہد کی۔ ہندو صرف مسلمانوں کے اتحاد سے خائف

ہوکر انہیں توڑنے کے لیے" ہندو مسلم اتحاد" کی بات کرتے تھے اور بدقسمتی سے اُنہوں نے "علماء" کے ایک گروہ کو اپنے ساتھ بھی ملا لیا تھا۔ یہ لوگ قائدِ اعظم کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش میں صبح و شام مصروف رہے اُنہوں نے یہ پروپیگنڈا پورے زور و شور سے کیا کہ قائدِ اعظمؒ انگریز کے دستِ راست ہیں۔ انہی کی اشارے پر قائد نے پاکستان کا نعرہ لگایا ہے تاکہ آزادی کی مشترکہ جدوجہد نہ کی جا سکے اور یہ قائدِ اعظم مسلمانوں کے تشخص کی بات کرتے ہیں مگر اسلام کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں ——
—— حالانکہ اصل بات صرف یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ انگریز کے ساتھ ساتھ ہندو کی غلامی سے جو مسلمانوں کو بچانا چاہتے تھے، کانگرس اور کانگرسی مولوی اسے کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

آج کچھ دوست ہمیں یہ کہتے ہیں کہ کانگرس اور جمعیتہ علمائے ہند کے علماء نے حصولِ آزادی کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں، انگریز کو اس برصغیر سے نکالنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے —— اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہندو انگریز کو یہاں سے نکالنا چاہتا تھا لیکن کیوں؟ کیا ہندو یہاں کے تمام رہنے والوں کو واقعی آزاد دیکھنا چاہتا تھا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہندوؤں کے اپنے ہم مذہب بھی ان کے غیر انسانی سلوک سے آج تک پریشان ہیں؟ کیا انہیں مسلمانوں کی انفرادیت ہضم ہو جاتی؟ کیا وہ یہ برداشت کر لیتے کہ مسلمان ان کے انگوٹھے تلے سے نکل آئیں؟ کانگرس کے ہندو انگریز سے ملک کو آزاد کرانے ہی کی کوشش میں نہیں تھے اُن کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انگریز کی غلامی سے اس لیے آزاد ہوں کہ مسلمانوں پر حکمرانی کر سکیں۔ وہ مسلمانوں کو حکومت کے کسی عمل میں شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں بھی "اقلیت" قرار دے کر ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتے تھے جو وہ ہمیشہ سے اقلیتی فرقوں کے ساتھ کرتے آئے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ان کا ازلی بیر تھا

پھر کیا مسلمانوں کا آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرنا جُرم ہے ؟ مسلمانوں کو تاریخ نے بھی یہی بتایا تھا اور خود اس وقت کے ہندو لیڈروں کے عمل نے بھی اس شہادت پر مُہرِ توثیق ثبت کر دی کہ ہندو مسلمان کو اپنا زیر دست دیکھنا چاہتا ہے، پھر وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو کی غلامی میں جانے کے سراب میں کیوں پھنستے اور ہر دو غلامیوں سے نکل آنے کی جدوجہد کیوں نہ کرتے ؟

قائداعظمؒ کی کوششوں پر مختلف انداز میں حملے کرنے والے اور ان کے موقف کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے اسلام کی پوری تاریخ سے صرفِ نظر کرتے ہیں، حقائق سے منہ پھیرتے ہیں، لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں ورنہ مسلمانوں کی زندگی کا چودہ سو سالہ عہد اس حقیقت پر دال ہے کہ اسلام کا الگ نظامِ معاشرت ہے، علیحدہ نظامِ اخلاق ہے، مختلف نظامِ تعلیم ہے، منفرد نظامِ حکومت و معیشت ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظریات متضاد ہیں، ان کا طرزِ فکر الگ ہے، ان کی سوچ مختلف ہے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن غیر مسلموں کے رہن سہن سے ممیز و ممتاز ہے اور انہوں نے ہمیشہ اسے برقرار رکھا ہے۔ اسی برصغیر میں ملت کو وطن سے مشتق قرار دینے والوں کے "بڑوں" نے جب وحدتِ ادیان کا چکر چلایا تھا، رام اور رحیم کو اک ذات قرار دینے کی سازش کی تھی اور مسلم تہذیب کی نسل کشی کرنا چاہی تھی تو مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ اس سازش کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے ملت کے خلاف اس کارروائی کو ہر قربانی دے کر روکا، اُنہوں نے اس میل جول کے خلاف آواز بلند کی اور اسلام کی بنیاد کو ڈھانے کے اس عمل کی بیخ کنی کر کے دم لیا۔ جلال الدین اکبر مختلف ادیان کی کھچڑی پکا رہا تھا اور "دینِ الٰہی" کے نام سے لوگوں کو گمراہ کرنے کی روش پر عامل تھا، حضرت مجددؒ نے بادشاہ اور اُس کے مصاحبوں کے ملحدانہ افکار کی طرف اہلِ دین کو متوجہ کیا۔ "وحدتِ ادیان"

کی اس تحریک کے نتائج یہ نکلتے کہ دینی عصبیت کم ہونے کے باعث مسلمان اپنی انفرادیت کھو بیٹھتے اور متحدہ قومیت کے اس تصور کے غلام بن جاتے جو اسلام کی اساس کے منافی ہے۔

جس طرح اس زمانے میں مسلمانوں کی انفرادیت ختم کرنے کی سازش کی جارہی تھی، بھگتی اور دینِ الٰہی کی تحریکیں جو بن پر تھیں اور مسلمان اور غیر مسلم کو ایک ہی قوم ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جارہا تھا، بالکل اسی طرح ہندو کانگرس اور کانگرس کے مسلمان ساتھی ملی تشخص کو برباد کرنے کے لیے "ہندو مسلم اتحاد" کی باتیں کرتے تھے۔ پھر اگر حضرت مجددؒ کی تقلید میں قائد اعظمؒ اور اُن کے ساتھیوں نے ہندوؤں اور ہندو دوستوں کی اس سازش کو دوبارہ پروان چڑھنے سے روک دیا تو کیا بُرا کیا۔ اور وہ ایسا کیوں نہ کرتے۔ تمام علمائے حق ان کے ساتھ تھے۔ ان علماء نے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے تتبع میں برصغیر کے گوشے گوشے اور قصبے قصبے میں حق کی آواز پہنچائی اور اس تشخص کو مجروح ہونے سے بچالیا، جس کی جرأت دشمنانِ اسلام کا ہمیشہ سے منتہائے مقصود رہا ہے۔

یہ نہیں کہ تمام علماء دیوبند کانگرس کے نام لیوا اور مسلمانوں کے تشخص کے مخالف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے جن چند علماء نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں مسلم لیگ کی حمایت کی اُنہوں نے اپنی ساری برادری سے دشمنی مول لی اور گالیاں کھائیں۔ علماء بریلی میں مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالغفور ہزاروی، علامہ عبدالعلیم میرٹھی، پیر صاحب مانکی شریف، سیال شریف، بھر چونڈی شریف، مولانا عبدالستار نیازی، علامہ احمد سعید کاظمی، پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری وغیرہ نے تحریک پاکستان میں دن رات کام کیا، پانچ ہزار علماء و مشائخ نے بنارس کے اجلاس میں پاکستان کے لیے کام کرنے کا عہد کیا اور قریہ قریہ میں اس پیغام کو پہنچا دیا۔

انگریز اور ہندو کا آپس میں اتحادِ فکر اور اتفاقِ رائے اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ جب برصغیر کی تقسیم یقینی ہو گئی تو جہاں انگریز کی یہ ماہ تک دونوں مملکتوں کے مشترکہ گورنر جنرل کے حق میں تھا اور ماؤنٹ بیٹن اس "ذمے داری" کو سنبھالنے کے لیے ہمہ تن تیار تھے، وہاں ہندوؤں نے اس تجویز کے حق میں کھلی رائے دے دی تھی اور پنڈت نہرو نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لکھ دیا تھا کہ ان کا مشترکہ گورنر جنرل رہنا ہندوؤں کے لیے بیحد مسرت کا مقام ہے لیکن قائد اعظمؒ نے ملت کے بہترین مفاد میں خود پاکستان کا گورنر جنرل بننے اور لیاقت علی خاں کو وزیر اعظم بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) اپنی تصنیف "ظہورِ پاکستان" میں اس کی جزئیات کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس بات پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن قائد اعظم سے اُلجھ پڑے اور دھمکیوں سے لے کر منت تک سب حربے استعمال کر ڈالے مگر قائد نے ایک ہی جواب دیا کہ یہ فیصلہ ذاتی مفاد میں نہیں، مسلمانوں کے اجتماعی مفاد میں کیا گیا ہے اور اس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ——— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں طاقتیں اس برصغیر کی تقسیم کی مخالفت میں یک زبان بھی تھے اور عمل بھی ان کا ایک جیسا تھا۔ اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ سمجھوتہ صرف انہی دو غیر مسلم طاقتوں کے درمیان تھا۔ مسلمان تو معتوب تھے، دونوں کے معتوب۔ اور صرف اس لیے کہ وہ اپنے تشخص، اپنی انفرادیت کی بات کرتے تھے، جو کسی بھی دشمنِ اسلام کو گوارا نہیں ہو سکتی ——— پھر قائد اعظم اور مسلم لیگ انگریز کے دوست ٹھہرے یا ہندو اور کانگرس؟

پھر کیا یہ بات واضح نہیں کہ انگریز مسلمانوں کا سرپرست ہوتا یا مسلم لیگ اس کے زیرِ اثر ہوتی یا قائد اعظمؒ اُس کے معتمد ہوتے تو برصغیر کی تقسیم کے وقت پنجاب، بنگال اور آسام کے علاقوں میں ڈنڈی مسلمانوں کے حق میں ماری جاتی، ہندو کے حق میں نہیں۔

یہ بات عجیب ہی نہیں، عبرت آموز بھی ہے کہ جو قوم شروع سے آخر تک مسلمان دشمنی میں انگریز کے ساتھ رہی انگریز کی ہم آواز تھی۔ آخر تک جس قوم کو انگریز نے ہر فائدہ پہنچایا وہ مظلوم اور معتوب قوم کو انگریز کا پٹھو ہونے کی گالی دے۔

جن "علماء" نے "ہندو مسلم اتحاد" کے نعروں میں کانگرس والوں کا آلۂ کار بننا منظور کیا تھا، اُنھوں نے قائد اعظمؒ کو "کافر اعظم" کہا، دین کو وطن کے مقابلے میں اور ہندوؤں سے دوستی کے تناظر میں پسِ پشت ڈال دیا، پاکستان کے حامیوں کو بدعتی اور مشرک قرار دیتے رہے، ذرائع ابلاغ کے ذریعے اور اپنی زبان درازیوں کے سہارے ان کے خلاف فضا پیدا کرنا چاہی۔ قائد اعظمؒ کو اسلام کی مبادیات سے بھی ناواقف گردانا گیا۔ اُنھیں ان کی وضع قطع کی بنا پر "انگریز" کہا گیا۔ حالانکہ حقیقت صرف یہ تھی کہ قائد اعظمؒ ان ہندو دوست "علماء" کے ممدوحین کی طرح منافقت کے قائل نہیں تھے۔ ان کے ظاہر و باطن میں اور گفتار و کردار میں کوئی تفاوت نہ تھا۔ وہ کانگرسی منافقت سے بیزار تھے۔ امیروں کے "مذہب دوستی" کی دعووں کی حقیقت سمجھتے تھے۔ جو فرد یا گروہ قرآن و سنت کے نام کو ذاتی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہو، حق اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ـــ باطل کا ساتھ دینے والے یہ علماء ہر لحاظ سے دروغ گوئی کو شعار کرتے رہے۔ اُنھوں نے قائد اعظم کے متعلق یہ کہا کہ انہیں اسلام کے بارے میں بنیادی حقائق بھی معلوم نہیں تھے۔ حالانکہ قائدؒ نے مختلف موقعوں پر اسلام کے متعلق جو باتیں کہیں، وہ اسلام کی روح سے واقفیت کی دلیل ہیں۔ خصوصاً اُنھوں نے راک لینڈ کے سرکاری مہمان خانے میں نواب بہادر یار جنگ کی موجودگی میں مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ کہا وہ صدق لکھنؤ کے ۱۹ جنوری ۱۹۴۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قائد اعظمؒ اسلام کے متعلق ان نام نہاد علماء سے کچھ زیادہ

ہی جانتے تھے۔

اندازہ فرمائیے کہ جب وہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد انگلستان گئے تو انہوں نے وہاں کے مشہور کالج "لنکن اِن" میں داخلہ صرف اس لیے لیا کہ اس کے دروازے پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِسم گرامی تحریر تھا۔ اور پھر یہ بات بھی کیا ایسے معاندین کی "حق گوئی" کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ نہیں ہے کہ جب شطرنج میں مات کھانے کے بعد انگلستان ہی کی ایک خاتون نے معاہدے کے مطابق اپنی مرضی یوں استعمال کرنا چاہی کہ محمد علی جناح اسے KISS (پیار) کریں تو جناح محض اس لیے مجلس سے واک آؤٹ کر گئے کہ اسلام نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی عورت کو "کس" (KISS) کرنے کی اجازت نہیں دی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر قائد اعظمؒ مسلمانوں کے حقوق کی بات نہ کرتے، ان کے لیے الگ مملکت کے قیام کا مطالبہ کر کے اس پر سختی سے ڈٹ نہ جاتے، انگریز کے جانے کے بعد ملت کو ہندو کی غلامی میں دینا پسند کرتے تو نہ انگریز کے معتوب ہوتے، نہ ہندو اُنہیں بُرا سمجھتا اور نہ کانگرسی علماء انہیں دشنام طرازیوں اور اتہام تراشیوں کا ہدف بناتے۔ لیکن اس مردِ قلندر نے تمام مصائب کا سامنا کیا، اپنوں اور بیگانوں کی باتیں سنیں، گالیاں برداشت کیں مگر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی راہ سے منہ نہ موڑا، مسلمانوں کی انفرادیت اور ان کے تشخص کو مجروح نہ ہونے دیا، انہیں ایک علیحدہ مملکت دلوا کر دم لیا۔ اللہ اس مخلص رہنما کی قبر پر رحمتیں نازل کرے اور ہمیں اس کے نقشِ قدم پر چلائے۔ آمین۔

ذکرِ قائدؒ

زندگی تاریکیوں میں گم تھی میرے ہم نشیں
تھی بھیانک تیرگی ماحول کے پیشِ نظر
اور فلک پر کوئی تارہ بھی نظر آتا نہ تھا
رات کی تاریکیوں میں ڈوب جاتی تھی سحر
جادۂ روشن دکھایا حضرتِ اقبالؒ نے
ہاں وہی جادہ کہ تھا جو منزلِ نجم و قمر
اس طرح کوشاں ہوئے راہِ وفا میں اہلِ ذوق
سعیٔ پیہم، جانفشانی، مطمحِ قلب و نظر
روشناسِ منزلِ مقصود ہو سکتے نہ تھے
رہنمائی قائدِ اعظمؒ نہ فرماتے اگر

(راجا رشید محمود)

یادِ قائدِ اعظمؒ ۔۔۔ زبان سے عمل تک

قائدِ اعظمؒ نے بے مثال جرأت، عدیم النظیر عزم و استقلال، بے پناہ خلوص زبردست قوتِ ارادی اور انتھک محنت و جانفشانی کے ذریعے انگریز کی سیاست، ہندو کی چالبازیوں اور مارِ آستین مسلمانوں کی دھوکہ دہی کے علی الرغم مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت حاصل کی۔ انہوں نے اپنے ظاہر او. باطن میں کبھی تفاوت نہیں پیدا ہونے دی۔ اُنہوں نے اپنے نصب العین اور مطمحِ نظر کی ارفعیت کے پیشِ نظر نہ کبھی داد و تحسین کی خواہش کی، نہ طعن و تشنیع سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ ان کی بے خوفی اور حق گوئی ضرب المثل ہے۔ قائدِ اعظمؒ کی زندگی مسلمانانِ برِ صغیر کے ذہنی اور سیاسی ارتقا کی تاریخ ہے۔ اُنہوں نے اہلِ اسلام کو ان کے اصلی مقام سے آگاہ کیا، ان کے اندر ایک ذہنی انقلاب برپا کیا اور اُنہیں بتایا کہ وہ اقلیت نہیں، ایک قوم ہیں۔ زندہ اور فعال قوم، جسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے، جس کی معاشرت اور تہذیب و تمدّن ہندوؤں سے الگ ہیں، جس کا اپنا تشخّص ہے اور اس تشخّص و تخصّص کے بقا ہی میں اس کی زندگی کا راز مُضمر ہے۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح علیہ الرحمہ کے فیضِ تربیت سے مُسلمانوں کو خود آگہی کی دولت نصیب ہوئی۔ اگر اس قوم میں خالقِ تصورِ پاکستان علامہ اقبالؒ اور بانیٔ پاکستان قائدِ اعظمؒ جیسی شخصیات جنم نہ لیتیں تو اس کی خودی کا خدا ہی حافظ تھا۔ اقبالؒ

نے خودی کے فلسفے کو معراجِ کمال تک پہنچایا تو قائد نے اس کو عملی شکل دے کر دُنیا پر اس کا تفوّق ثابت کر دیا۔ ہم عرفانِ نفس کی دولت سے مُتمتع ہوئے ہیں تو ان رہنماؤں کے فکر و کردار کے باعث قوم نے اپنے آپ کو منوایا ہے تو انہی کی بتائی ہوئی راہوں پر چل کر۔

چشمِ عالم نے بنظرِ غائر دیکھا کہ قائداعظمؒ حقیقت پسند آدمی تھے۔ مبالغہ آمیزی، تصنّع اور جھوٹ سے اُنہیں دلی نفرت تھی۔ وہ نظم و ضبط کے پاسدار تھے، اُنہوں نے اعلائے کلمۃ الحق کو اپنی زندگی کی اساس سمجھا۔ وہ بات کے دھنی تھے، حق و صداقت کے داعی تھے، اسلام کے بے باک سپاہی تھے۔ ان کی انگلیاں ہمیشہ ملت کی نبض پر رہیں۔ اُنہوں نے فہم و فراست کے ساتھ مسلمانوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر عزت و آبرو کی زندگی گزار سکیں۔ وہ انگریزوں کی غُلامی سے نجات دلا کر اسلام کے نام لیواؤں کو ہنود کی غُلامی میں جکڑنے کے مخالف تھے اور اپنے اِس موقف کی صداقت کے ثبوت کے لیے اُنہوں نے تدبّر و حکمت کے ذریعے "ہندو مسلم اتحاد" کے بلند بانگ نعروں کی قلعی کھول کر رکھ دی اور دنیا پر واضح کر دیا کہ جب کسی قوم کو قائدِاعظم جیسا لیڈر مل جاتا ہے تو اسے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔

قائدِ اعظمؒ کی یاد کو حرزِ جاں بنانا اور تصنیف و تالیف کے پہلو سے ان کو خراجِ عقیدت و ارادت پیش کرنا نہایت اہم ہے۔ جو قومیں اپنے محسنوں کو بھول جانے کی روش اپنالیں، وہ زیادہ دیر صفحۂ ہستی پر زندہ نہیں رہتیں۔ ان کی یاد ہماری زندگی ہے، ان کا ذکر ہمارے قلب و جاں کے لیے پیغامِ راحت و سکون ہے۔ ہم ان کی بات کر کے دراصل اپنی ملی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں، لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ وہ جن راہوں کے راہی تھے، ہم اُنہی رستوں پر چل رہے ہیں یا کہیں ان سے بھٹک رہے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ نے جن اصولوں کو حاصلِ حیات جانا، وہ ہمارے

لیے کوئی اہمیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اُنہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے جو طریق کار اختیار کیا، آیا ہم اُن کے مقصد کو پیشِ نظر رکھے ہوئے ہیں اور اس مقصد تک رسائی کے لیے انہی کے قائم کردہ طریقوں پر عامل ہیں یا کہیں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ ہم قائدِ اعظمؒ کی یاد کا دائرہ گفتار سے کردار تک وسیع کرتے ہیں یا نہیں!

قائدِ اعظم نے زندگی بھر منافقت کے خلاف جہاد کیا، اپنے قول و فعل میں ہمیشہ مطابقت رکھی، جو کچھ کہا کیا۔ بہت سے لوگوں نے انہیں کوٹ پتلون پہننے پر مطعون کیا، ہدفِ طنز بنایا مگر اس مردِ قلندر نے خول پہننے سے انکار کر دیا۔ ان کے مقابلے میں کانگرس کے دھرماتما کھدر پوشی کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھے۔ لکھ پتی، کروڑ پتی سیٹھ، کاروں، بنگلوں کے تعیّشات میں بسر کرنے والے جلسوں میں "غریب دوستی" کا لباس زیب تن کر کے جاتے تھے۔ گاندھی جی ساری عمر ننگ دھڑنگ رہے، لنگوٹی کا دکھاوا کرتے رہے مگر بانیٔ پاکستان نے اس قسم کی دھوکہ دہی سے ہمیشہ نفرت کی، ان کی زبان احقاقِ حق کے لولوئے لالہ اُگلتی رہی، ان کے قدم درست سمت میں چلتے رہے، ان کی ساری زندگی بے داغ رہی۔ لیکن ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے کبھی غور کیا کہ ہم میں سے کتنے ہیں، جو اس صفت سے متصف ہیں۔ ہماری زندگیوں میں منافقت کو کتنا دخل ہے۔ ہم ظاہر و باطن کے تضاد کا شکار تو نہیں۔ کیا ہم وہی کرتے ہیں، جو کہتے ہیں یا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

قائدِ اعظمؒ کی فرض شناسی ضرب المثل ہے، انہیں ہر وقت اپنی ذمہ داری کا احساس رہتا تھا۔ اُنہوں نے کام کو ہمیشہ اوّلیت اور اہمیت دی۔ ڈاکٹر نے کئی سال پہلے اُنہیں علالت کی شدت سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن اس فرض شناس رہنما نے ملّت کے کام پر ذات کو قربان کر دیا اور معالج سے وعدہ لیا کہ وہ ان کی بیماری کا کسی سے بھی ذکر نہیں کریں گے تاکہ جس نصب العین کے حصول کے لیے اُنہوں نے اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی، وہ

نامکمل نہ رہ جائے۔ ان کے سیکرٹری کا کہنا ہے کہ بستر مرگ پر بھی انہیں قوم و ملک کی ذمے داریوں کا سب سے زیادہ احساس تھا اور ایک دفعہ سرکاری کاغذات پر دستخط کرتے کرتے نڈھال ہو گئے تھے ——— پھر کیا قائداعظم کے سارے نام لیوا سرکاری ملازم اسی تندہی، جانفشانی اور محنت سے سرکاری کام انجام دیتے ہیں۔ کیا ہم میں اپنے محبوب قائد کی اس خصوصیت کی کوئی رمق ہے کہ جو وقت قوم و ملک کی خدمت کے لیے مختص کیا گیا ہے اس کے ضیاع سے باز رہیں۔ پھر قائداعظمؒ وقت کے سختی سے پابند تھے۔ فرمایا کرتے تھے "جس قوم میں وقت کی پابندی کا احساس نہ ہو، وہ دنیا میں سرفراز نہیں ہو سکتی۔" ایک دفعہ ایک حجام اپنے مقررہ وقت سے دو منٹ تاخیر سے پہنچا تو آپ نے حجامت بنوانے سے انکار کر دیا۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے کہ ہم پابندیٔ وقت کا کتنا خیال کرتے ہیں۔

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۹۱۸ء میں ہوم رول لیگ کی نمایندگی کرتے ہوئے لارڈ ولنگڈن جیسے جابر و مستبد حکمران کو جو کھری کھری سنائیں یا مونٹ بیٹن کے تقسیم برِصغیر کے بعد بھی دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل رہنے کی خواہش کو خاک میں ملا دیا اور وائسرائے ہاؤس میں اس کی چیخیں دھاڑ کا جو منہ توڑ جواب دیا یا بمبئی ہائیکورٹ کے جج کی ذاتی رائے کو پرِ کاہ کے برابر وقعت نہ دینے کا عدالت ہی میں اعلان کیا۔ کیا ہم میں سے کسی کی عادات میں یہ بے خوفی، یہ دلیری، یہ جرأت اور حق گوئی شامل ہے۔ کیا ہم بھی حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی قائدِ اعظمؒ کی روش پر گامزن ہیں؟

قائدِ اعظمؒ خوشامد کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان کی تعریف میں غلو سے کام لیتا تو فوراً ٹوک دیتے اور وہ آدمی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ پھر کیا ہم بھی حضور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر قائدِ اعظمؒ کی طرح

عمل پیرا ہو سکتے ہیں کہ اپنی بے جا تعریف کرنے والے کے منہ کو مٹی سے بھر دو۔

ہمارے ممدوح ہر قسم کے جذبات کے اظہار میں انضباط کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں حیدر آباد کے ہوائی اڈے پر ہجوم کے جوشِ عقیدت سے بے قابو ہو جانے پر قائد نے ہوائی جہاز سے اس وقت تک اُترنے سے انکار کر دیا تھا، جب تک بدنظمی کی اصلاح نہ ہو۔ گاندھی جی نے کہا کہ قائد اعظم کو نہ کوئی خرید سکتا ہے اور نہ ہی ملک و ملّت کے خلاف استعمال کر سکتا ہے، ڈاکٹر امبیدکر کہتے ہیں:

"یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جناح کسی قیمت پر بھی برطانیہ کے آلۂ کار نہیں بن سکتے۔ ان کے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ کسی قیمت پر بھی خریدے نہیں جا سکتے۔"

سیٹفورڈ کرپس نے کہا:

"مسٹر جناح ان لوگوں میں سے تھے، جو اپنے اصولوں میں کسی قسم کی نرمی برداشت نہیں کر سکتے۔"

بیگانے بھی جن کی تعریف و توصیف میں رطبُ اللساں ہیں، ہم اپنے اُن کی خوبیوں کو کس حد تک اپنے اندر سمو سکے ہیں؟ ہم نے ان کے تتبّع اور تقلید کا کتنا حق ادا کیا ہے، ہم نے ان کی حیات سے کیا سبق لیا ہے۔

غرضیکہ قائدِ اعظم مرحوم و مغفور جن سیکڑوں خوبیوں کے مالک تھے، جن خصائص سے ان کی زندگی عبارت ہے، ہمیں صرف ان کا تذکرہ کر کے ہی نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم کے اس محسن کی زندگی کا ہر لمحہ ہم اپنی زندگیوں کے لیے نمونہ بنالیں۔ ان کی صداقت کو شعار کریں، ان کی حق گوئی اور حق پرستی اور استقلال کو اپنائیں۔ ان کی طرح اپنے آپ کو نظم و ضبط کا پابند بنالیں، تضیعِ اوقات کے مرتکب نہ ہوں، اپنی جان و مال و آبرو کو دین اور

ملک سے زیادہ اہم نہ سمجھیں، قوتِ ارادی کو مفلوج نہ ہونے دیں، مخالفین کی تعداد زیادہ ہو، اپنوں میں بھی غدار ہوں تو ہر پہلو پر نظر رکھتے ہوئے اپنے موقف سے سرِمُو تفاوت نہ کریں۔ اپنی معاشرت، اپنی تہذیب، اپنے دین، اپنی انفرادیت کی حفاظت کریں، خودی کو کسی طاقت کے آگے رہن نہ رکھیں، عرفانِ نفس کے مقام کو پالیں اور احتسابِ نفس کو شعار بنالیں۔ حقیقت پسندی ہمارا طرۂ امتیاز ہو، مبالغہ آمیزی سے ہم نفور ہوں۔ یعنی ہم میں سے ہر فرد، جو ملّت کے مقدر کا ستارہ ہے، قائدِ اعظمؒ کی یاد کو ذکر واذکار کے دائرے سے نکال کر اپنے اعمال و افعال پر پھیلا دے اور اُس پاکستان کی دل وجان سے حفاظت کرنے کا عہد کرے، جس کے حصول کے لیے بانیٔ پاکستان نے اپنی صحت، اپنی جان کی پروا نہیں کی تھی۔ اگر ہم یادِ قائدِ اعظمؒ میں اس بات کا تہیہ کرلیں کہ قائد کی فراست اور قیادت کے باعث ملنے والے ملک کو نقصان نہیں پہنچائیں گے تو یقین کیجیے کہ قائد اعظمؒ ہم سے خوش ہوں گے۔ اگر ہم تاجر ہیں تو ملاوٹ کرکے، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری کے مرتکب ہو کر ملک کو کمزور کرنے کی حماقت نہ کریں۔ اگر ہم ملازم ہیں تو حرام خوری میں وقت نہ گزاریں، رشوت اور سفارش کو دفاتر سے نکال دیں، دیانت داری اور ایمان داری سے خدمات انجام دیں۔ مزدور ہیں تو ملوں، فیکٹریوں کو قوم و ملک کی امانت سمجھیں، دل لگا کر کام کریں، املاک کا نقصان نہ ہونے دیں۔ اگر سرمایہ دار ہیں تو غریب کا خون نہ چوسیں، ٹیکس بچانے کے لیے تگ و دو ترک کر دیں۔ اس طرح زندگی کے جس شعبے میں بھی ہمارا عمل دخل ہو ہمیں چاہیے کہ اپنے ہر کام کے ملک و قوم پر ہونے والے دور رس اثرات سے صرفِ نظر نہ کریں تاکہ اس پاکستان کو نقصان نہ پہنچے جس کے بانی سے محبت کے ہم دعویدار ہیں۔

قیامِ پاکستان اور ہندوؤں کی مخالفت

برِصغیر میں مسلمانوں کے تشخص و تخصص کے موضوع پر انفرادی طور سے مختلف نیک خواہانِ ملّت اظہارِ خیال کرتے رہے اور ہندوؤں سے اپنی الگ معاشرت، اپنے منفرد دین اور اپنی مختلف سوچ کے مختلف انداز کے باعث ان سے مل کر رہنے کی مشکلات کا ذکر ہوتا رہا، مگر دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اکیسویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مفکرِ ملّت شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے فرمایا کہ مسلمان کا دین ایک معاشرتی تخیّل نہیں بلکہ زندہ اور ہمہ گیر حقیقت ہے ... ہمیں وہ نظامِ حکومت قابلِ قبول ہوسکتا ہے جس میں مذہب کو سیاست میں جذب ہونے پر مجبور نہ کیا جائے۔ بعد میں چودھری رحمت علی نے اس تخیّل کو ایک واضح اور معیّن شکل میں پیش کیا اور ۱۹۳۳ء میں باقاعدہ "پاکستان" کے نام سے ہندوستان میں ایک مسلم حکومت کی تحریک شروع ہوگئی۔ ہندوؤں کے غیر منصفانہ رویّے کے پیشِ نظر آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں علامہ اقبال کے نظریۂ پاکستان کی روشنی میں اپنا طریقِ کار طے کیا۔ اس موقع پر قائدِ اعظم نے اپنے خطاب میں فرمایا:

"ہمارے ہندو دوست اسلام اور ہندو دھرم کی حقیقی نوعیت کا اندازہ کرنے میں کیوں ناکام رہتے ہیں۔ اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں ہیں بلکہ دو مختلف و متمیز معاشرتی نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو

خواب و خیال ہی سمجھنا چاہیے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترک
قومیت تخلیق کر سکیں گے۔"

جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ ان پر مشتمل ایک علیحدہ مملکت کے قیام کے اِدعا ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان اسلام کے خاص اصولوں کے تحت اپنا قومی تشخص و امتیاز برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ سیاسی جدوجہد میں بھی ہندوؤں کے قدم بہ قدم چل کر مسلمان اس نتیجے پر پہنچے کہ کانگرس مسلمانوں کی معتمد جماعت بننے کے زعم میں ان کی ملّی وحدت کی جڑیں کاٹنے میں برابر مصروف ہے۔ اور مستقبل میں شدید خطرہ تھا کہ مرکز پر ہندوؤں کا غلبہ رہا تو وہ مسلمانوں کے مفاد کو بے پناہ نقصان پہنچائیں گے۔ چنانچہ خالصًا دین کی بنیاد پر ایک ریاست کے حصول کے لیے جو جدوجہد کی گئی، وہ اسلام کے تمام نام لیواؤں کی دلی خواہش تھی۔ قائداعظم نے ۲۵ دسمبر ۱۹۴۲ء کی تقریر میں کہا:

ہندوستان کے مسلمان مجھ سے اس قدر الفت و محبت کا برتاؤ کرتے ہیں۔
اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں نے وہی کچھ علی الاعلان کہا ہے
جو کروڑوں مسلمانوں کے دل میں تھا۔"

عامۃ المسلمین تو سیدھے سادے الفاظ میں "پاکستان کا مطلب کیا — لا الٰہ الا اللہ" جانتے تھے۔ اس کے لیے "لے کے رہیں گے پاکستان" کے فلک شگاف نعرے لگاتے رہے اور جذبوں کی سچائی نے آخرکار ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی شکل اختیار کر لی۔

ہندوؤں نے نہ تصورِ پاکستان کو اور نہ قیامِ پاکستان کو دل سے تسلیم کیا۔ وہ اب تک پاکستان کے خلاف اندرونی و بیرونی سازشوں کی نیو ڈالتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم اِس حقیقت کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلم لیگ کی رہنمائی

میں عامتہ المسلمین کے پاکستان بنانے کے موقف کے متعلق ہندوؤں کا طرزِ عمل کیا تھا۔ انہوں نے پاکستان کی مخالفت میں کیا کچھ کہا۔ اس سے یہ واضح ہوگا کہ ہندو اگر تقسیم برِصغیر کے فارمولے کا اس حد تک مخالف تھا تو پاکستان کا وجود اس کی آنکھوں میں مسلسل کیوں نہ کھٹکتا۔

سب سے پہلے پاکستان کے متعلق گاندھی جی کا دیا گیا بیان ملاحظہ ہو:

"جب یہ تصور کرتا ہوں کہ یہ تجویز عملی طور پر کیا ہو گی تو اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا کہ سارے ہندوستان کی بربادی ہے"۔

(قائداعظم کے نام ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو گاندھی کا خط)

سر رادھا کرشنن نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں جلسہ تقسیمِ اسناد کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے کہا:

"اسلام نسلی اور مذہبی برادری کی روایتی پالیسی کے خلاف نہیں ہے۔ اس وقت جن مسائل سے ہمارا سابقہ ہے ان کا تعلق ہمارے ہندو یا مسلمان ہونے سے نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستانی ہونے سے ہے"۔

لالہ لاجپت رائے نے سی آر داس کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کا تذکرہ قائداعظم نے ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کے مسلم لیگ کے صدارتی خطبے میں بھی کیا۔ لالہ صاحب نے تحریر کیا:

"میں سات کروڑ مسلمانوں سے نہیں ڈرتا، لیکن سوچتا ہوں کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان اور افغانستان، مشرقِ وسطیٰ، وسطِ ایشیا، عرب، عراق، شام کے مسلمان مل کر ناقابلِ مزاحمت ہو جائیں گے۔ میں مسلمان لیڈروں پر اعتماد کرنے کے لیے پوری طرح تیار بھی ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث کے احکام کا کیا کروں۔ مسلمان رہنما ان کو پس پشت ڈال نہیں سکتے،

مجھے اُمید ہے کہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے آپ اپنی دانائی اور دانشمندی سے کوئی راہ نکالیں گے۔"

ہندوؤں کے مشہور قانون دان اور مدبر سر تیج بہادر سپرو نے "ٹونٹی اتھ سنچری" نامی انگریزی رسالے میں "مسٹر ایمری اور بمبئی کانفرنس" کے زیر عنوان ایک مقالے میں لکھا:

"میں ان تمام سکیموں کا سخت مخالف ہوں جن کا مقصد ہندوستان کو تقسیم کر دینا ہو۔ میری تجویز اب یہی ہے کہ برٹش گورنمنٹ اپنی طرف سے ایک دستور نافذ کر دے۔ برطانوی گورنمنٹ میں جو کچھ نقائص بھی ہوں، اس میں شبہ نہیں کہ شہنشاہ اکبر کے بعد صرف انگریز ہی تھے، جنہوں نے ہندوستان کی جغرافیائی اور سیاسی وحدت مرتب کی اور اسے برقرار رکھا۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کو پاکستان کا مطالبہ کرنے والے کروڑوں مسلمان "مٹھی بھر لوگ" معلوم ہونے لگے۔

"ایک مٹھی بھر لوگوں کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نسلی، تہذیبی اور لسانی کسی قسم کے اختلاف نہیں ہیں۔"

(نیویارک ٹائمز ۱۹، جولائی ۱۹۴۲ء)

سر چھوٹو رام نے ۸، اگست ۱۹۴۴ء کو کہا:

"مسلم لیگ کو غیر مسلمانوں کے مفاد کی بالکل پروا نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں، پاکستان کے خواب کو پنجاب میں ترقی نہ پانے دوں گا۔"

پاکستان کے مطالبے کی وجہ سے مسلم لیگ سے کانگرس کو جو خدشہ لاحق ہو گیا تھا، اس کے پیش نظر سبھاش چندر بوس نے قائداعظم کے نام اپنے ۲، اکتوبر ۱۹۳۸ء کے مراسلے میں لکھا کہ:

"لیگ کو اس کی توقع نہ رکھنی چاہیے کہ کانگرس اسے مسلمانانِ ہند کی مستند نمائندہ جماعت تسلیم کر لے گی۔"

اور ظاہر ہے کہ کانگرس نے لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہ بننے دینے کے لیے بہت سے مسلمانوں کو اور ان کی چھوٹی بڑی جماعتوں کو لالچ دیئے مگر بحمداللہ کہ پاکستان بن کر رہا۔

آل انڈیا کانگرس کے صدر اچاریہ کرپلانی نے کانگرس کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا:

"یہ خیال غیر تاریخی، غیر قانونی، غیر تحقیقی اور غیر حقیقی ہے کہ ہندو مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں میں لباس کے سوا کوئی تفریق نہیں۔"

۱۹۳۳ء میں جب چودھری رحمت علی نے تقسیم ہند کی تجویز کو باقاعدہ مطالبے کی صورت میں برطانوی حکومت کے سامنے پیش کیا تو برٹش گورنمنٹ نے واضح طور پر یہ جواب دیتے ہوئے مطالبہ مسترد کر دیا کہ:

"یہ تصور تو قدیم مسلم ایمپائر کی تجدید و احیا کا تصور ہے۔"

لیکن آخر انہیں مسلمانوں کی قوت کے سامنے مجبور ہونا پڑا اور ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی الگ مملکت وجود میں آ گئی۔

اب گاندھی کے قانونی و سیاسی مشیرِ خاص ڈاکٹر جیکار کو سنیئے:

"پاکستان کا تصور مسلم انفرادیت کا تصور ہے، تمام ہندوستانیوں اور انگریزوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھنے کے مسئلے میں دلچسپی لیں بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی بہ نسبت برطانیہ کو اس مسئلے میں زیادہ حصہ لینا چاہیے کیونکہ انہوں نے اپنی ڈیڑھ سو سال کی محنت سے ہندوستانی وحدت کو پیدا کیا اور برقرار رکھا۔"

(ہندو مدراس۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۱ء)

خود گاندھی جی فرماتے ہیں :

"میرے نزدیک جس قوم کو اپنی محافظ فوج اور امورِ خارجہ پر اختیار نہیں، وہ آزاد قوم نہیں کہلا سکتی۔ اگر کسی قوم کی فوجیں کسی بیرونی قوت کے ماتحت ہیں خواہ وہ دوستوں کی قوت کیوں نہ ہو، اس کی حکومت ہرگز ذمے دار نہیں ہے۔ یہ وہ سبق ہے جو ہمارے انگریز اُستادوں نے ہمیں پڑھایا ہے۔"

(قوم کی آواز۔ تقاریر گاندھی جی)

یعنی مالیات، امور خارجہ اور ملکی حفاظت کے حامل اختیارات وہ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو ان سے محروم کرنے کی سازش تھی۔ تو کیا مسلمان ہی ایسے گئے گزرے تھے کہ یہ سب کچھ ہندوؤں کے حوالے کر کے محکوم بن جاتے۔

نیشنل لبرل فیڈریشن آف انڈیا نے ۱۳ جولائی ۱۹۴۱ء کے اجلاس میں جو قرارداد منظور کی، اس میں کہا گیا :

"اب اگر کوئی خطرہ پیدا ہوا تو حکومت برطانیہ کا ساتھ دینے والے ہندو ہی ہوں گے۔ کیونکہ خود ہندوؤں کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ ہندوستان ہندوستان رہے، اسلامستان نہ بن جائے۔"

ہندو بہرحال ہندوستان کو ہندوستان رکھنے اور اس کے اسلامستان نہ بن جانے کے خیال سے پاکستان کے قیام کے دل سے مخالف تھے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے انگریزوں کی خوبیاں گنوا گنوا کر ان سے فریاد بھی کی مگر پاکستان کو خدا کے فضل و کرم سے قائم ہونا تھا، وہ ہو کے رہا۔

قیامِ پاکستان کے اساسی نظریات

پاکستان کو قائم ہوئے چھتیس ۳۶ سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ بدقسمتی نے اس کو دولخت کر دیا۔ ہماری کمزوریوں نے اسے اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہونے دیا، ہماری انفرادی اور اجتماعی سوچ "پاکستانی" نہ ہوئی۔ سرمایہ دار نے ملک کے استحکام کو پیشِ نظر نہ رکھا، ذاتی منفعت کو اہمیت دی۔ مزدور کے سامنے قومی مفاد نہیں، حقوق کی یاد دہانی ہے، فرائض کی پاسبانی نہیں۔ ملازم تضیعِ اوقات سے ملک کو نقصان پہنچاتا ہے، احساسِ ذمّے داری کی دولت سے بہرہ ور نہیں۔ معلّم نئی نسل کو قوم کا معمار نہیں بناتا، ٹیوشن چاہتا ہے، علم نہیں سکھاتا بلکہ بااوقات علم رکھتا ہی نہیں۔ متعلم درس گاہوں میں غنڈہ گردی کو سربرآوردہ دیکھتا ہے تو اسی طرف مائل ہوتا ہے۔ وہ ڈگری کا طالب ہے، علم کا نہیں۔ تاجر جلبِ زر کی انتہائی خواہش کے زیرِ اثر مہنگائی بڑھاتے ہیں، ملاوٹ کرتے ہیں، لوگوں کی جانوں سے کھیلتے ہیں۔ ہر آدمی راتوں رات امیر بن جانا چاہتا ہے، اس کے لیے ہر حربہ جائز سمجھتا ہے۔ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی "بے ایمانی" میں سے جو ممکن ہو، اس کے لیے ہر فردِ بشر ہر وقت آمادہ ہے ——— ایسے میں جب ہم پاکستان کے قیام کی بات کرتے ہیں، تحریکِ پاکستان کی جدّوجہد کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہیں، مقصدِ پاکستان کو یاد کرتے ہیں تو قول و عمل کا یہ تضاد کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

پاکستان اس دعوے کے ساتھ حاصل کیا گیا تھا کہ اسے اسلام کا گہوارہ بنایا جائے گا

اگر اس کے حصول کی تحریک میں عامۃ المسلمین کی حد تک پاکستان کا مطلب کیا ــــ لا الٰہ الا اللہ کو حرزِ جاں بنایا گیا تو خواص نے بھی اسلام ہی کو نظریۂ پاکستان سمجھا اور سمجھایا۔ اصل بات یہ ہے کہ برِصغیر کا مسلمان اپنے ملی تشخص و تخصص کی بات کرتا تھا اور اس بات کو منوانے کا نام "پاکستان" ہے۔ ہندو الگ قوم ہے، مسلمان الگ۔ ان کا دین و مذہب علیحدہ، ان کی معاشرت جدا، ان کا طرزِ فکر مختلف، ان کے نصب العین اور مقاصدِ حیات میں بُعد ـــــ پھر یہ صرف مسلمان کے زندہ رہنے کا ذکر نہیں کہ وہ کس طرح حیاتِ مستعار کے دن پورے کرے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کا جینا مرنا، اس کی زندگی کے مختلف گوشے، اس کی سوچ کے سارے دھارے اللہ کے لیے ہیں۔ حضور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو دنیا کے ہر فردِ بشر تک پہنچانا اور عالمِ انسانیت کے ہر ذرّے کو اس کی برکتوں سے مستفید کرنا اس کا حاصلِ حیات ہے۔ اسے صرف زندگی ہی بسر نہیں کرنا ہے کہ وہ محکوم رہ کر بھی کی جا سکتی ہے، حاکم بن کر بھی۔ وہ اگر سریر آرائے مملکت ہے تو بھی خدا کی نیابت کا فرض ادا کرتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام، اُن کی سیرت اور ان سے الفت کو عام کرتا ہے۔ اگر کسی ریاست کا عامی ہے تو بھی اس کی زندگی انہی مقاصد کے لیے ہے ـــــ دین سے الگ ہو کر مسلمان ایک بہت بڑا صفر ہے۔

ہماری قومی بدبختی ہے کہ دنیا کے پہلے اور واحد نظریاتی ملک پاکستان کے باسی اس گفتگو میں بھی مصروف پائے گئے کہ پاکستان ہم نے اسلام کے لیے حاصل کیا تھا یا اس کا کوئی اور مقصد تھا، ملتِ مسلمہ اپنا تشخص چاہتی تھی یا بھوک کا علاج۔ اگر آج کوئی شخص اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ مسلمان بھوکا تھا، اس گرسنگی کے ازالے کے لیے الگ ملک چاہتا تھا تو اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ طرزِ فکر نیا نہیں ہے جب ہم اسلام کی بات کر رہے تھے، دین کی تجربہ گاہ کے طور پر ایک ملک کے حصول کی

تگ و دو کر رہے تھے، کچھ مخالفین نے اس وقت بھی یہ کہا تھا کہ مسلمان افلاس دور کرنا چاہتے ہیں لیکن آخر کار ایسوں کا افلاسِ ذہن ظاہر ہو گیا اور حالات نے وضاحت کر دی۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسے میں پنجاب کے ایک رکن نیکی رام شرما نے کہا تھا:

"چاروں اکثریتی صوبوں میں لیگ چاروں شانے چت گرے گی۔ مسلمان بھوکے ہیں وہ اسی کو ووٹ دیں گے جو انہیں روٹی دے گا۔"

لیکن انتخاب نے ثابت کر دیا کہ مسلمان روٹی کے لیے اپنی آزادی، اپنا ایمان، اپنا تشخص نہیں دے سکتا۔ اس نے ان روٹی دینے والوں کے منہ پر زنّانے کا تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

تحریکِ پاکستان کی وجوہ کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ اسلام کے تشخص کے متعلق قائدِ اعظم محمد علی جناح نے فرمایا:

"ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں، زبان و ادب، فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر، نام و نسب، شعورِ اقدار و تناسب، قانون و اخلاق، رسم و رواج، تاریخ و روایات اور رجحانات و مقاصد ہر لحاظ سے ہمارا اپنا زاویۂ نگاہ اور فلسفۂ حیات منفرد ہے۔"

(یکم جولائی ۱۹۴۴ء ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو بیان)

"پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا، جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا، مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن اور نسل نہیں۔"

(۸ مارچ ۱۹۴۴ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

"۔۔۔ آپ نے خود فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟

مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ ہندوؤں کی تنگ نظری یا انگریز کی چال نہیں ـــــ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔"

(۸ مارچ ۱۹۴۴ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

"اسلام ہر مسلمان کے لیے ضابطۂ حیات بھی ہے جس کے مطابق وہ اپنی روزمرہ زندگی، اپنے افعال و اعمال اور حتیٰ کہ سیاست و معاشیات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ اسلام سب کے لیے انصاف، رواداری، شرافت، دیانت اور عزت کے اصولوں پر مبنی ہے۔"

(۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کراچی بار ایسوسی ایشن)

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا واحد ذریعہ اس سنہری اصولوں والے ضابطۂ حیات پر عمل کرنا ہے جو ہمارے عظیم واضع قانون پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے قائم رکھا ہے۔"

(۱۴ فروری ۱۹۴۸ء سبی دربار بلوچستان بحوالہ میراثِ قائدِ اعظم از ڈاکٹر جاوید اقبال)

یہ تو بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظمؒ کے سینکڑوں ارشادات میں سے چند ہیں۔ مفکرِ پاکستان حضرت علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الٰہ آباد اجلاس کے صدارتی خطبے میں متحدہ مسلم ریاست کی تشکیل کا مطالبہ کرتے ہوئے فرمایا،

"ہندوستان میں ایک جداگانہ تمدنی نظام کی حیثیت سے اسلام کی بقا اس امر پر موقوف ہے کہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت کو قائم رکھ سکے ـــــ اس لیے میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد کی خاطر ایک متحدہ اسلامی ریاست کا مطالبہ کرتا ہوں۔۔۔۔ اس طرح اسلامی قانون تعلیم اور تمدن کو نئی زندگی ملے گی اور انہیں اصلی روح کے مطابق ڈھالا

جا سکے گا اور عصرِ جدید کی روح کے قریب لایا جا سکے گا۔"

علامہ کی زندگی کے آخری دو برسوں ۳۷-۱۹۳۶ء کے قائدِ اعظم کے نام خطوط سے پاکستان کی تجویز کے سیاسی اور تمدنی پہلوؤں کی تشریح ہو جاتی ہے۔ ان خطوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے قائدِ اعظم کو قائل کر دیا تھا کہ پاکستان ہی مسلمانوں کی جملہ سیاسی مشکلوں کا واحد حل ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں جو تاریخی قرارداد پیش کی گئی وہ علامہ ہی کے پیش کردہ نظریات پر مبنی تھی۔

تحریک پاکستان کے دو بڑوں کے خیالات کو جاننے کے بعد اگر ہندوؤں سے استفسار کیا جائے کہ وہ کانگرس کے پلیٹ فارم سے "ہندو مسلم اتحاد" کا نعرہ لگانے میں کتنے مخلص ہیں تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ "ہندو قومی تحریک" میں بھائی پرمانند لکھتے ہیں:

"تاریخ میں ہندو پرتھوی راج، شیواجی اور بیراجی کے ناموں کی عزت کرتے ہیں، جنہوں نے ہندوستان کی عزت اور آزادی کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کی، در آنحالیکہ مسلمان محمد بن قاسم جیسے حملہ آور اور اورنگ زیب جیسے حکمران کو اپنا قومی ہیرو سمجھتے ہیں۔"

(بحوالہ ورڈکٹ آن انڈیا۔ از بیورلی نکلسن)

دیکھیے کہ مشہور ہندو لیڈر لالہ ہردیال ۱۹۲۸ء میں "اسلامی حکومت" کے تصور سے کتنے خائف ہیں اور اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں:

"افغانستان اور سرحد پر ہندو شدھیاں ہونی ضروری ہیں۔ ورنہ سوراج حاصل کرنا بے سود ہو گا۔ کیونکہ پہاڑی قومیں ہمیشہ بہادر اور بھوکی ہوتی ہیں۔ اگر وہ ہماری دشمن بن جائیں گی تو ملک ہمیشہ بے کسی کی حالت میں رہے گا اور پھر نادر شاہ اور زمان شاہ کا زمانہ شروع ہو گا۔ اب تو

انگریز افسر سرحد کی حفاظت کر رہے ہیں لیکن ہمیشہ ۱۹۱۹ء نباشد (جب امان اللہ خاں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا) کہ ہندوؤں کے ملک کو بچانے کے لیے سمندر پار سے افسر آتے رہیں گے۔ اگر ہندو اس فرض سے غافل رہے تو پھر ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی (روزنامہ ملاپ لاہور - ۲۳ جون ۱۹۲۸ء)

ہندوؤں کی زبان کے جادو سے جمعیت علمائے ہند کے بڑے بڑے رہنما مسحور تھے اور ان کے چرنوں میں بیٹھنا اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے لیکن "مسلم دوستی" کی حقیقت جاننے کے لیے گاندھی جی کا یہ بیان دیکھیے:

"غلط ہو یا صحیح لیکن گئو سیوا اور گئو پوجا کے معاملے میں ہندوؤں کے مذہبی جذبات بہت گہرے ہیں اور اگرچہ وہ اہنسا کے قائل ہیں اور کسی کی جان لینے کو برا سمجھتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ انگریزی فوجوں کا رعب اور ڈر بیچ میں حائل نہ ہو تو وہ گائے کی قربانی روکنے کے لیے تلوار اٹھانے پر بھی تیار ہو جائیں گے۔"

(سٹیٹسمین مارچ ۱۹۱۸ء)

مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کیے گئے ان اقتباسات سے ایک اور بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں اسلام کے نام پر علیحدہ ملک کے قیام کا تذکرہ کیا جاتا ہے، وہاں بھی اور اس کے علاوہ بھی کانگرس کے جغادری حکومت برطانیہ سے مدد چاہتے ہیں، اس کے گن گاتے ہیں، اس کی مہربانی پر سراپا سپاس ہیں ــــــ اگرچہ یہ گالی مسلم لیگ کو دی جاتی ہے مگر قارئین کرام کانگرس کی "انگریز دشمنی" کی اصلیت خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے کرتا دھرتا ڈاکٹر مونجے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت

سے مطالبے کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھتے ہوئے فرزندانِ توحید کو کچل دینے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں :

"برٹش گورنمنٹ اس سال نئی آرمی بنا رہی ہے اس کا اگر صرف ہندوؤں پر مشتمل ہونا ممکن نہ ہو تو جتنی کثرت و فراوانی ممکن ہو، ہندوؤں کی ہونی چاہیے کیونکہ پانچ لاکھ کی اس آرمی کی بدولت کوئی مسلمان پاکستان کا سوال اُٹھانے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

(اخبار ہندو مدراس۔ ۳۰ جون ۱۹۴۱ء)

آج کل تو اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک میں کوئی بھی شخص کسی بھی وقت اسلام کے خلاف زہر افشانی کر سکتا ہے اور جو کچھ چاہے کہہ سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا مسلمان بھی اپنی جان و مال و آبرو کی قربانیاں اس مقصد کی خاطر دے رہے تھے اور غیر مسلم بھی اسی لیے پاکستان کے مخالف تھے۔ دیوان چندی داس برمال نے شملہ میں ایک اخباری بیان دیا جس میں یہ کہا:

"پاکستان کے اصول کو تسلیم کرنا ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہوگی۔ پاکستان میری رائے میں خطرناکیوں سے بھرپور ہے اور قطعی طور پر اسلام ازم کی ایک کڑی ہے۔" (ہندو مدراس۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۴ء)

مشہور بنگالی ہندو لیڈر ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کہتے ہیں :

"پاکستان کا مطالبہ دراصل اسلام کو از سرِ نو ہندوستان میں حکمران دیکھنے کی آرزو ہے۔" (اخبار ہندو مدراس ۲۴ دسمبر ۱۹۴۴ء)

ڈیسائی لیاقت فارمولے کے اعلان کے بعد ۱۷ جون ۱۹۴۵ء کو خود گاندھی جی نے وائسرائے کے نام اپنے تار میں "ہندو مسلم اتحاد" کی قلعی یوں کھولی :

"کانگرس اور مسلم لیگ کی مساوات تو سمجھ میں آسکتی ہے لیکن اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مساوات قائم کر کے غیر ارادی طور پر آپ اپنی کانفرنس کو ناکام بنا دیں گے۔"

(آزادیٔ ہند۔ مترجم رئیس احمد جعفری)

ہندوستان کے مسلمانوں کی دلی پکار "پاکستان" کو پنڈت جواہر لال نہرو "کچھ" لوگوں کی آواز قرار دیتے ہیں:

"آج کل کچھ مسلمان ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں، اور کچھ لوگوں نے اس مسئلے کو بڑا سنجیدہ بنا رکھا ہے۔"

(نیویارک ٹائمز۔ ۱۹ جولائی ۱۹۴۲ء)

ان چند اقتباسات سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مسلمان عوام و خواص بھی پاکستان کے حصول کی کوشش احیائے اسلام کے لیے کر رہے تھے اور غیر مسلم بھی بجا طور پر پاکستان کے تصور کو "اسلامستان" ہی سمجھتے تھے۔ یہی خیال ان کے لیے سوہانِ روح تھا کہ اسلام کے عملی نفاذ کے بعد جو مثالی ریاست معرضِ وجود میں آئے گی، وہ کفر کی صورت کے لیے موت کا پیغام ثابت ہو گی۔ لیکن تعجب اس پر ہے کہ کچھ "علما" بھی پاکستان کی مخالفت کرنے لگے اور کرتے رہے۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تصنیف "انڈیا ونز فریڈم" میں کہتے ہیں:

"میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا نقطہ ہی میری طبیعت قبول نہیں کرتی۔ اس کا مطلب ہے کہ دنیا کا ایک حصہ تو پاک ہے، باقی ناپاک۔ پاک اور ناپاک کی بنیاد پر کسی قطعۂ ارض کی تقسیم قطعاً غیر اسلامی اور روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام اس طرح کی کوئی تقسیم قبول نہیں کرتا۔"

ویسے تو قرآن و حدیث کی رُو سے مولانا آزاد کا محولہ بالا ارشاد بھی قابلِ بحث ہے

مگر غیر مسلموں کے پاکستان کے بارے میں مندرجہ بالا تاثرات اور ان کی بنیاد پہ اس تصور کی مخالفت کے تناظر میں مولانا کی "پاکستان" سے چڑ اور وہ بھی اسلام کا نام لے کر سمجھ میں نہیں آتی۔ بہرحال یہ حادثہ ہوا کہ کانگرس نے بہت سوں کو بوجوہ اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان لوگوں نے قائدِ اعظمؒ اور ان کے ساتھیوں پر کیچڑ اچھالا اور دشنام طرازی کی، اتہام لگائے مگر پاکستان خدا کے فضل و کرم سے قائم ہو کے رہا۔

پاکستان کی بنیاد اسلام تھی، اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن بعض لوگ جھوٹ اس کثرت اور تواتر سے بولتے ہیں کہ ناواقفانِ حال اسے سچ سمجھنے لگتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پیر جماعت علی شاہ علی پوری مولانا شبیر احمد عثمانی، پیر عبدالرحیم بھرچونڈی، پیر صاحب مانکی شریف، خواجہ قمرالدین سیالوی، مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالعلیم میرٹھی، مولانا عبدالستار خان نیازی، علامہ احمد سعید کاظمی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالغفور ہزاروی جیسی شخصیتیں پاکستان کے حصول کے لیے قائدِ اعظم کی مخلص سپاہی تھیں۔ ان کا حلقۂ اثر پورے برِصغیر کو محیط تھا۔ یہ برصغیر کے کونے کونے میں پہنچے اور پاکستان کے حق میں فضا پیدا کی۔ کیا یہ شخصیتیں ایسی ہیں کہ اگر یہ ملک اسلام کے علاوہ کسی اور بنیاد پہ حاصل کیا جا رہا ہوتا تو یہ اس کے حصول کی جد و جہد میں شریک ہوتے؟۔

بعض لوگ پاکستان کے قیام کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمان معاشی لحاظ سے مضبوط ہونا چاہتے تھے اور ہندوؤں کے ہوتے ان کی یہ خواہش بار آور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے معاشی بنیاد پر نیا ملک قائم کرنا چاہا اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ اس بات کے ایک پہلو پر تو میں مضمون کے آغاز میں گفتگو کر چکا ہوں لیکن میرے نزدیک اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام کے نام پر ملک حاصل کیا گیا اور اسلام محض عبادات کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ یہ مذہب نہیں دین

ہے، دینِ کامل و اکمل ــــ اس کا جہاں ایک نظام عبادت ہے، وہاں نظام اخلاق بھی ہے۔ نظامِ حکومت بھی، نظامِ معاشرت بھی اور نظامِ معیشت بھی۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے اگر انسانوں اور جنّوں کو پیدا ہی عبادت کے لیے کیا گیا ہے۔ اور نماز برائیوں سے روکتی ہے ــــ تو اس میں نظمِ سلطنت کو چلانے کے رہنما اصول بھی بتا دیے گئے ہیں اور ان پر حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی سیرت کے نمونے بھی ہیں۔ حکومت کے انتظام کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ حاکم خداوند تعالیٰ ہے، مسلمان محض اس کا نائب ہے، منتظم ہے اور یہ انتظام اسے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے کرنا ہے۔ اس معاشرے کی اصلاح کے لیے بھی دینِ متین نے پوری پوری رہنمائی کی ہے اور معاشی الجھنیں تو اسلام نافذ کرنے سے پیدا ہی نہیں ہو سکتیں، جہاں دولت کمانے کی بھی حدیں ہوں اور خرچ کرنے کی بھی۔ جہاں حیات کے سارے شعبے ایک دوسرے سے متعلق، منسلک اور مربوط ہوں۔ جہاں احتکار و اکتناز کے مرتکبین کی عبادت بھی قبول نہ ہو اور انہیں معاشرے میں باعزت مقام بھی حاصل نہ ہو سکے ــــ وہاں ظاہر ہے کہ جب اسلام کو نافذ کرنے کے لیے کوئی خطۂ زمین حاصل کیا جائے تو اس کے سائے میں آنے والوں کو جہاں عبادتوں کی برکات سے متمتع ہونے کا موقع ملے گا، وہاں اسلامی معاشرت بھی فروغ پائے گی، اسلام کا نظامِ سیاست و حکومت بھی ثمر آور ہو گا اور اسلام ہی کی معیشی اصلاحات سے معاشرہ خوشحال ہو جائے گا ــــ اس لیے اگر ان معنوں میں یہ کہا جائے کہ پاکستان حاصل کرنے کا مقصد مسلمانوں کی معاشی بہبود سمیت اسلام کی ساری خوبیوں سے اہلِ اسلام کو مستفید کرنا تھا تو یہ بات غلط نہ ہو گی۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفت اور علما

تحریکِ پاکستان کو عامۃ المسلمین میں مقبول بنانے کا کارنمایاں اگرچہ علما اور مشائخ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا۔ انہی کی شبانہ روز محنت نے پاکستان کے مطالبے کو مسلمانوں کی اجتماعی آواز بنا دیا۔ خان عبدالغفار خاں نے قیامِ پاکستان کے لیے علما و مشائخ کی کوششوں کا ذکر اپنے انداز میں یوں کیا ہے: "حکومت اور مسلم لیگ نے پنجاب اور سرحد کے گدی نشین پیر اور پرہیزگار سب کو کوٹھڑیوں سے نکال کر الیکشن کے میدان میں جھونک دیا تھا۔" (آپ بیتی - از خان عبدالغفار خاں۔ ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ دہلی - ۱۹۶۹ء - ص ۱۶۴) مشہور صحافی اور ادیب ابوسعید انور اپنے ایک مقالے میں آل انڈیا سُنّی کانفرنس بنارس کے قیامِ پاکستان کے سلسلے میں نمایاں کردار کا بالتفصیل ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مندرجہ ذیل بزرگوں پر مشتمل ایک رہبر کمیٹی تشکیل دی گئی، مولانا شاہ مصطفٰی رضا خاں بریلوی، حضرت سید محمد کچھوچھوی، حضرت مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی، شیخ الاسلام خواجہ قمرالدین سیالوی، حضرت مولانا محمد امجد علی، حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی، حضرت خواجہ شاہ دیوان آلِ رسول علی خان سجادہ نشین اجمیر شریف، حضرت سید ابوالبرکات حزب الاحناف، حضرت عبدالحامد بدایونی، حضرت پیر سید عبدالرحمٰن بھرچونڈی (سندھ) حضرت مولانا سید زین الحسنات پیر مانکی شریف

(سرحد) حضرت مولانا سید احمد قادری اور خان بہادر حاجی مصطفیٰ خان مدراس ـــــ اس کمیٹی نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کے لیے اپنے مکتبۂ فکر کے تمام مشائخ عظام کی اس طرح تنظیم کی کہ ملک کے گوشے گوشے سے پاکستان کے لیے آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔" (نوائے وقت لاہور۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء)

برصغیر کے تمام علماء کرام کے علاوہ مشائخ طریقت نے بھی اپنے عقیدت مندوں پر زور دیا کہ دامے، درمے، سخنے پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کریں۔ معروف صحافی ممتاز لیاقت لکھتے ہیں: "مشائخ بھی اس میدان میں پیچھے نہ رہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں پیر مانکی شریف کی دعوت پر پشاور میں سرحد اور پنجاب کے مشائخ کا ایک عظیم الشان اجتماع ہوا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سجادہ نشین، خواجہ حسن نظامی، متولی درگاہ حضرت بوعلی قلندر، پیر جماعت علی شاہ (علی پوری) اور پیر فضل شاہ وغیرہم نے اپنے مریدوں کو پاکستان کی حمایت کرنے کا حکم دیا۔" (ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور۔ اگست ۱۹۶۶ء۔ صفحہ ۳۱۔ مضمون "تحریک پاکستان میں علما کا حصہ")

اہلِ سنت وجماعت (جنہیں عرفِ عام میں "بریلوی" کہا جاتا ہے) نے من حیث الجماعت پاکستان کے قیام کی کوششوں میں بھرپور کردار ادا کیا۔ سنی علما، مشائخ طریقت، سنی صحافی، سنی شعرا اور سنی عوام نے انگریزوں اور ہندوؤں کے زیر اثر زندگی گزارنے کے تصور کی تغلیط کی، دو قومی نظریے کی دن رات تبلیغ کی، اور بالآخر اگست ۱۹۴۷ء میں ان کی خواہشوں نے "پاکستان" کی صورت میں عملی تعبیر پائی۔ "آپ (اعلیٰحضرت بریلوی) کے تیار کردہ علماءِ کرام نے دو قومی نظریے کی افادیت اور ہندو مسلم اتحاد کے نقصانات سے عوام کو آگاہ کرنے کے لیے رسائل وجرائد کا اجرا کیا جن میں سے السواد الاعظم مراد آباد، الفقیہ امرتسر، ماہنامہ

"انوار الصوفیہ لاہور / سیالکوٹ / قصور، اور ماہنامہ انجمن نعمانیہ لاہور قابلِ ذکر ہیں۔ اِن رسائل کے ذریعے دو قومی نظریے کی وضاحت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ہندو کے ماضی سے روشناس کرایا گیا۔۔۔" (جادہ پیما: فائد صدی نمبر ۶، ۱۹۷۰ء۔ گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا۔ مضمون "تحریکِ پاکستان منزل بہ منزل" از پروفیسر ولی محمد)

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند اولیاء کرام ہی کے دم قدم سے اسلام کے نور سے مستنیر و مستفید ہوا۔ اولیاء ہی کے نام لیوا عامۃ المسلمین اور علما و مشائخ نے من حیث المجموع پاکستان کے حق میں نعرہ بلند کیا، اس کے قیام کے لیے قربانیاں دیں اور کوششیں کیں اور پاکستان درحقیقت اولیاء اللہ ہی کا فیضان ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ آغا شورش کاشمیری نے بھی لکھا ہے۔۔۔ ملاحظہ فرمائیے: "بہرائچ میں سالار مسعود غازی کا مزار ہے۔۔۔ مزار کے اندر چاروں طرف سیخوں میں عرضیاں لٹکی ہوتی ہیں، میں نے مجاور سے پوچھا تو اس نے بتایا، حاجتمند لوگ آتے، کاغذ پر سوال لکھتے، تار میں پروتے اور سوا روپیہ صندوقچی میں ڈال کر چلے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مراد معینہ مدت کے اندر اندر پوری کر دیتے ہیں۔ میں مجاور کے جواب پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "بھئی، یہاں زندہ پیر عرضیاں نہیں لیتے، یہ بزرگ تو سو رہے ہیں۔" "اجی آپ آزما لیں!"۔۔۔ میں نے سفید کاغذ لیا، قلم نکالا اور لکھا۔ "السلام علیکم۔ آپ اہل اللہ میں سے ہیں، میں چاہتا ہوں، اس ملک سے اواخر ۱۹۴۷ء تک انگریز نکل جائیں اور ملک آزاد ہو جائے۔ یہ میری دلی آرزو ہے۔ دستخط شورش کاشمیری۔" میں نے درخواست لکھ کر تار میں پرودی، سوا روپیہ صندوقچی میں ڈالا، فاتحہ پڑھی اور چلا آیا۔ ظاہر ہے کہ برعظیم کی آزادی اس عرضی کا نتیجہ نہ تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ انگریز ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان

چھوڑ گیا۔" (بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل۔ جلد اوّل از شورش کاشمیری۔ مطبوعات چٹان لمیٹڈ لاہور۔ اشاعت اول جولائی ۱۹۷۲ء۔ صفحہ ۳۰۳، ۳۰۴)

قائدِ اعظم علیہ الرحمہ کے جانشین ساتھی سیاسیین بھی اولیاء اللہ کے نام لیوا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت کا تعلق رکھنے والے تھے۔ مثلاً بہادر یار جنگ مشہور ہی عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں میں شرکت اور اس موضوع پر تقاریر کی وجہ سے تھے۔ قائدِ اعظم کے ساتھ بہادر یار جنگ کی پہلی ملاقات بھی عید میلاد النبی کے ایک جلسے میں شاید ۱۹۳۴ء میں بمبئی میں ہوئی تھی (مکاتیب بہادر یار جنگ۔ بہادر یار جنگ اکادمی کراچی، بار اول جون ۱۹۶۷ء۔ ص ۵۰۹)

چودھری خلیق الزمان بھی انہی خیالات کے بزرگ تھے۔ انہوں نے میلاد مبارک کی مقدس محفل میں خطاب کے لیے جون ۱۹۴۳ء میں بہادر یار جنگ کو دعوتِ خطاب دی۔ (مکاتیب بہادر یار جنگ صفحہ ۴۳۱)

سردار عبد الرب نشتر کے بارے میں شورش کاشمیری لکھتے ہیں: "نشتر خدا پرست ہی نہیں، پیر پرست بھی ہیں، ان کے روحانی مرشد حضرت شاہ محمد غوث علیہ الرحمہ کا مزار دہلی دروازے کے باہر، دفتر احرار کے بالمقابل واقع ہے اور ان کے مزار پر تاریخِ وصال کا جو سنگی قطعہ لگا ہوا ہے، وہ نشتر ہی کے فکر کا نتیجہ ہے۔"
(چہرے از شورش کاشمیری۔ مکتبہ ماحول کراچی۔ بار اول جنوری ۱۹۶۵ء۔ صفحہ ۶۵)

مشہور صحافی مرتضیٰ احمد خاں میکش عقیدہ کے لحاظ سے سُنّی تھے۔ انہوں نے بہت پہلے پاکستان کے تصور کو قلم کے واسطے سے عام کیا تھا۔ شورش لکھتے ہیں: "مرتضیٰ احمد اخبار نویسی کے حلقے سے نکل کر مشائخ کے حلقے میں چلے گئے تو سفید اجلی داڑھی نے حلیہ ہی بدل دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں ایک عالم کی روح، ادیب

کا حُسن، شاعر کی رنگینی، رند کا ظرف، فقیر کا گداز، مجاہد کا ولولہ اور بادشاہ کی تمکنت تھی۔ قلم فروشی سے انہیں تنفّر تھا۔ ابھی پاکستان کا تصوّر چند افراد کے ذہن میں تھا کہ انہوں نے انقلاب میں مسلسل مقالے لکھ کر پاکستان کو ہندو مسلم مسئلے کا حل قرار دیا۔" (نورتن از شورش کاشمیری۔ مطبوعات چٹان لاہور۔ اشاعت اول جون ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے پاکستان کے لیے ان کی خدمات پر تفصیلی گفتگو کی ہے: "انہوں نے روزنامہ انقلاب میں جو لاہور کا ایک مقبول اور کثیر الاشاعت روزنامہ تھا، چار مسلسل مضامین کا ایک سلسلہ لکھ کر شائع کیا جس میں انہوں نے واضح اور کھلم کھلا الفاظ میں یہ لکھا تھا کہ ہندو مسلم مسئلہ کا حل ایک مسلم قومی وطن جو پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی صوبۂ سرحد پر مشتمل ہو، کے قیام میں مضمر ہے۔ یہ مضامین دسمبر ۱۹۲۸ میں شائع ہوئے تھے۔ ان کی اشاعت نے ایک اردو روزنامہ پرتاب (پنجاب کا ایک مہاسبھائی اخبار) کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس نے بڑی شدت کے ساتھ اس خیال کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کے جواب میں مولانا مرتضیٰ احمد خاں نے ایک جواب الجواب جاری کیا اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ حقِ خود ارادی کے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اصول کی بنیاد پر ایک مسلم قومی وطن کا قیام وہ واحد مقصدِ اعلیٰ ہے جس کے لیے مسلمان قربانیاں پیش کر سکتے ہیں۔" (پاکستان ٹائمز ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء۔ مضمون "..." از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید)

سُنّی اخبارات و جرائد نے پاکستان کے حق میں رائے عامہ کو بیدار کرنے میں بہت کام کیا۔ مثال کے طور پر روزنامہ "سعادت" فیصل آباد / لاہور کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ پرچہ پرانے مسلم لیگی کارکن جناب ناسخ سیفی کی ادارت میں ۲۷ اگست ۱۹۳۰ء کو پندرہ روزہ اخبار کی صورت میں لائلپور (ضلع فیصل آباد) سے

جاری ہوا۔ ناسخ سیفی کا نام "امام بخش ناسخ کمالوی" تھا اور غلام رسول انور (جو بعد میں انور نظامی کے قلمی نام سے معروف ہوئے) اور عبدالستار بھٹی مدیران اعزازی تھے۔ سعادت نے اپنا آغاز تحریک پاکستان کی ترجمانی سے کیا۔ مثلاً تیسرے شمارے (۱۰ ستمبر ۱۹۴۳) میں "رموز و نکات" کے عنوان سے لکھا گیا: "کیا کبھی کانگرس نے حادثہ پانی پت یا مسئلہ شہید گنج میں بھی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ہندو قوم کو ہڑتال کا حکم جاری کیا؟ مگر ہمارے خود غرض کانگرسی مسلمان لیڈر ہیں کہ "نیا آئین" ہو یا "تحریک بوچڑ خانہ" ——— ہڑتال کی تحریک کر دیتے ہیں۔"
(صفحہ ۲)

سعادت بعد میں ہفت روزہ ہوگیا اور ۲۲ اپریل ۱۹۴۵ء سے کمالیہ کے بجائے لائلپور (اب فیصل آباد) سے نکلنا شروع ہوا۔ فیصل آباد میں جب قائد اعظم کی صدارت میں کانفرنس ہوئی تو اس موقع پر "سعادت" کا خصوصی نمبر شائع کیا گیا۔ مشائخ عظام اور علمائے اہل سنت کے پیغامات کو عوام تک پہنچانے اور خاص طور پر بنارس، مراد آباد اور دیگر مقامات پر تحریک پاکستان کو مضبوط کرنے کے لیے منعقد ہونے والی سنّی کانفرنسوں کے انعقاد میں سعادت نے اہم کردار ادا کیا۔ تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور تعمیر پاکستان کے لیے سعادت کی خدمات کے مفصل جائزے اور حقائق و معارف پر مشتمل راقم الحروف کی تصنیف عنقریب شائع ہو گی تو جدوجہد آزادی کے طالب علم کے لیے بعض نئے گوشے سامنے آئیں گے۔

سعادت کمالیہ نے ۱۵ نومبر ۱۹۴۲ء کے شمارے کو "مسلم لیگ نمبر" کے طور پر شائع کیا اور "اھلاً و سھلاً و مرحبا" کے زیر عنوان اداریے میں حضرت قائد اعظم اور مسلم لیگ کے دیگر اکابر کی فیصل آباد میں تشریف آوری پر اظہار تشکر و امتنان کیا

سعادت کے فائل اس حقیقت کے اظہار میں بخیل نہیں کہ جگہ جگہ مسلم لیگ کے زیر اہتمام عید میلاد النبیؐ کے جلسے ہوتے تھے اور عید میلاد کے جلسوں میں مسلم لیگی زعما خطاب کرتے تھے۔ مثلاً "۲۱ مئی ۱۹۴۵ء کو چھاؤنی فیروز پور میں اسلامیہ ہائی سکول میں میلاد النبی کا جلسہ ہوا جس میں ملک جمال الدین صاحب، قاضی مرید احمد صاحب مبلغ مسلم لیگ میانوالی اور سید غلام مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی نے سیرۃ النبیؐ پر تقریریں کرتے ہوئے مسلم لیگ کا پیغام مسلمانان فیروز پور چھاؤنی کو پہنچایا۔" (سعادت لائلپور۔ ۲۲ مئی ۱۹۴۵ء)

اہلِ سنت وجماعت کی قیامِ پاکستان کے لیے شبانہ روز محنت اور خدماتِ جلیلہ کے باعث پاکستان اور سُنّی لازم وملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ سعادت کے ۸ جولائی ۱۹۴۵ء کے شمارے کے مطالعے سے حسین بھائی لال جی اور نواب سجاد علی خاں نائب صدر آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے بیانات سامنے آتے ہیں۔ حسین بھائی کہتے ہیں۔ "سُنّی مسلمان اور ان کے سیاسی ادارہ مسلم لیگ کو خوشنما اصولوں کے بار بار اعادہ کرنے اور مسلم حقوق ومراعات کے بارے میں زور زور سے گفتگو کرنے میں کبھی بھی تھکن محسوس نہیں ہوتی لیکن ان حقوق ومراعات کے معنی صرف سُنّی حقوق ومراعات کے ہیں۔" نواب سجاد علی خاں نے فرمایا: "مسلم لیگ جو بیشتر سُنّی مسلمانوں کی جماعت ہے، ہماری نمایندگی نہیں کرتی۔ لہذا وہ ہمارے حقوق کی اہل نہیں۔" (صفحہ ۴)۔

اہلِ سُنّت نے پاکستان کو دین وایمان کا مسئلہ قرار دیا تھا۔ سعادت کی ایک خبر ملاحظہ ہو: "اتوار کی شب کو جامع صابریہ لائل پور میں محفل میلاد منعقد کی گئی۔ مولانا عبد الغفور صاحب ہزاروی وزیر آبادی نے شانِ رسالت کے موضوع پہ تقریر فرمائی اور آخر میں آپ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے

جمع ہوں۔ سوادِ اعظم سے الگ رہنا گمراہی ہے۔ علمارِ احناف کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہیے۔" (سعادت، یکم جولائی ۱۹۴۵ء۔ صفحہ ۲)۔ ۸ر جولائی ۱۹۴۵ء کے شمارے میں حضرت امیر ملت محدث علی پوری، سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ گورداسپور، حضرت پیر سید فضل شاہ امیر حزب اللہ جلال پور شریف، حضرت میاں علی محمد صاحب بسی شریف والے، سید سدید الدین شاہ صاحب سجادہ نشین تونسہ شریف، سجادہ نشین دربارِ غوثیہ سکھو چک ضلع گورداسپور اور دیگر مشائخ عظام کے اعلانات شائع کیے گئے کہ سب مسلمان پاکستان کے قیام کی جدو جہد میں شریک ہوں۔

پاکستان کے حامی اور پرچارک سیاستدانوں، عالموں، صحافیوں اور عامیوں میں سے بیشتر حضرات اہل سنت وجماعت کا عقیدہ رکھنے والے تھے ——— اس حقیقت کا احقاق میرا آج کا موضوع نہیں۔ آج تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسلمان اور خاص طور سے مسلمان علما کی فہرست میں کون سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے تن، من دھن سے متحدہ قومیت کو رنگ و روغن بخشا، "ہندو مسلم اتحاد" کے فراڈ کا ساتھ دیا، ہندوؤں کے تابع مہمل بنے رہے اور ایسا کیوں ہوا ——— ؟؟

نامور مؤرخ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں: "خاکسار، جمعیت علما اور دیگر جماعتوں نے مسلم لیگ کے خلاف ایک محاذ بنالیا۔ مجلسِ احرار کے واعظانِ آتش مقال اور علمارِ شیوا بیان دورے پر نکل پڑے۔ مجھے بمبئی کا وہ جلسہ یاد ہے جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور شورش کاشمیری کی خطابت نے رنگ باندھ دیا تھا لیکن بُری طرح پیٹے۔ دیوبند کے طلبا کی ایک جماعت مولانا حسین احمد مدنی مغفور کی سربراہی میں شہر شہر اور قریہ قریہ کا گشت کر رہی تھی۔

"جہاں موقع ملتا، مولانا آزاد بھی پروانہ پیدا کر کے یعنی طلبا رہ پر اُڑ کر پہنچ جاتے۔ غرض تفریق بین المسلمین اور تضعیف شوکت مسلمین میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا"۔ (حاشیہ آزادئ ہند۔ مقبول اکیڈمی لاہور۔ طبع ششم ۱۹۷۳۔ ص ۱۴۵)

برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق کی محافظ جماعت مسلم لیگ تھی جس کے متعلق امیر ملت پیر جماعت علی شاہ نے فرمایا تھا: "دو جھنڈے ہیں، ایک اسلام کا، دوسرا کفر کا ۔۔۔۔ اس وقت اسلامی جھنڈا مسلم لیگ کا ہے۔" (برگ گل۔ تقریب صد سالہ جشن ولادت قائد اعظم۔ وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی، ۱۹۷۶، صفحہ ۱۹۲۔ مضمون "قائد اعظم اور امیر ملت" از محمد صادق قصوری) مسلمانوں کی اس واحد نمائندہ جماعت کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کا دیا گیان ملاحظہ ہو: "بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام "لیگ" رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتشکدہ رکھ دو گے تو کیا برف کی سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی؟ اگر تم ایک کھلونے کا پتلا لے کر اس کے سینے کے پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے تاکہ اپنے دونوں ہاتھ ہلا کر تالی بجائے تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائے گا؟" (مسلمان اور کانگرس از ابوالکلام آزاد۔ آزاد بک ڈپو، لاہور۔ سول ایجنٹ سجے ہند پبلشرز لاہور۔ ص ۴۲) ——— مولانا شبلی نے تحریر کیا ہے "اس موقع پر پہنچ کر دفعتہً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے، مسلم لیگ۔ یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالیٹکس ہے؟ خدا نخواستہ نہیں۔ انٹی کانگرس ہے، نہیں۔ کیا ہاؤس آف لارڈز ہے؟ ہاں، سوانگ تو اسی قسم کا ہے ۔۔۔ مسلم لیگ نہ صرف آج بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹکس نہیں بن سکتی ۔۔۔ پالیٹکس ایک سخت قومی احساس ہے، اس کا ظہور بیگار کے طریقہ پر نہیں ہوتا۔" رسمئے لالہ فام از ڈاکٹر

جاوید اقبال۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ اشاعت اول ۱۹۶۶ء۔ ص ۸)

پاکستان کو کن لوگوں نے گالیاں دیں، انہیں بھی پہچاننے چاہیے۔ مولانا حفظ الرحمٰن ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماءِ ہند نے فرمایا: "بلاشبہ پاکستان کا یہ تخیل 'سیاسی الہام' ہے۔ مگر ربانی الہام نہیں ہے بلکہ قصر بکنگھم کا الہام ہے جو کہ ڈاکٹر اقبال کو بھی جب ہی ہوا تھا جب وہ لندن سے قریب ہی زمانہ میں واپس تشریف لائے تھے اور وہ الہام دوبارہ اس وقت پھر ہوا جبکہ مسلم لیگ کے وفد نے جو کہ بسرکردگی چودھری خلیق الزمان مصر اور لندن کا حج کرنے گیا تھا۔" (نئی زندگی الہ آباد۔ خاص (پاکستان) نمبر۔ ۱۹۴۶ء۔ مضمون "پاکستان پر ایک نظر" صفحہ ۲۸)

پاکستان کا تخیل پیش کرنے اور مسلمانوں کے حقوق کی آواز بلند کرنے پر علامہ اقبالؒ کو علما کے ایک گروہ نے جتنی گالیاں دیں، وہ اگر اکٹھی کی جائیں تو بڑی بڑی ضخامت کی کئی جلدوں پر مشتمل ملفوظات کا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ رحمتاز حسن کہتے ہیں: "دیوبندی خیالات کے علما اقبال کو ایک آزاد خیال ملحد سمجھتے ہیں" (بحوالہ معمارانِ پاکستان از منشی عبدالرحمٰن خاں۔ شیخ اکیڈمی لاہور۔ بار اوّل نومبر ۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۳۲۹)

علامہ اقبال ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ دو قومی نظریے کے ہر مبلغ اور حامی کو دشنام طرازی کا ہدف بنایا گیا۔ قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو کافرِ اعظم تک کہا گیا۔ ذفار انبالوی لکھتے ہیں: "علماءِ دیوبند کی اکثریت بلکہ غالب اکثریت حضرتِ قائدِ اعظم سے سوءِ ظن رکھتی تھی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے ہم خیال چند علما کے سوا سبھی مخالفت کا اظہار کرتے تھے ..... سبھی مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کا نام لے کر ایسی جلی کٹی سناتے تھے جو کسی غیر مسلم کے منہ سے بھی زیب نہ دیتیں۔ مثال کے طور پر قائدِ اعظم کو انہی بزرگوں نے کافرِ اعظم کہا ......" (نوائے وقت

لاہور۔ ۱۹ جنوری ۱۹۷۹ء)۔ بحوالہ مجلۃ العزیز ساہیوال۔ یکم مئی ۱۹۸۰ء) مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔ "(مولانا احمد علی لاہوری) بعض مرتبہ اہلِ حکومت پر تنقید کرتے، بعض مرتبہ پاکستان کے بانیوں پر۔" (پُرانے چراغ۔ از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مجلس نشریاتِ اسلام کراچی۔ صفحہ ۱۵۳)

دیوبند ہی کا نہیں، ان علماء کے دیگر مراکز کا بھی یہی حال تھا۔ علامہ اقبال نے ۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ کو سید نذیر نیازی کو لکھا "(آپ) جامعہ (ملیہ دہلی) سے کچھ دل برداشتہ بھی ہیں۔" اس کی وضاحت میں سید نذیر نیازی کہتے ہیں۔ "میں واقعی جامعہ سے بد دل ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ جامعہ کی تعلیمی اور سیاسی روش میں میرا اختلاف روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اختلاف کی وجہ وہی جامعہ کا اسلامی قومیت کی بجائے وطنی قومیت کی طرف رجحان تھا۔" (مکتوباتِ اقبال۔ سید نذیر نیازی۔ اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور ۱۹۷۷ء۔ صفحہ ۱۲۱)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے فرمایا: "مگر افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۷، ۳۸) ۔ ترجمان القرآن کے شمارہ فروری ۱۹۴۶ء میں کہا گیا "جنت الحمقا میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقعہ وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریے پر بنے گا۔" (صفحہ ۱۵۴)

قائدِ اعظمؒ کے خلاف "کافرِ اعظم" کا فتویٰ دینے کا "مبارک فریضہ" بھی مجلسِ احرار اور جمعیت علماءِ ہند نے انجام دیا۔ شورش کاشمیری لکھتے ہیں۔ "۔۔۔ یہی وہ جلسہ

تھا جس میں مظہر علی نے قائدِ اعظم کی شادی کا شوشہ چھوڑا اور انہیں کافرِ اعظم کہا

اک کافرہ عورت کے لیے دین کو بیچا
یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم

لاہور کے ہندو اخباروں نے اس شعر کو خوب اُچھالا" (بوئے گل نالۂ دل دود چراغِ محفل، صفحہ ۱۷۲)۔ "مولانا حسین احمد صاحب نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیتے اور قائدِ اعظم کو "کافرِ اعظم" کا لقب دیتے ہوئے حال میں جو فتوٰی دیا تھا، اس کا جواب مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی نے اپنے مکتوب میں جو دہلی کے ایک روزنامہ میں شائع ہوا ہے، حسبِ ذیل جواب دیا ہے۔۔۔" (رہبرِ دکن حیدر آباد دکن۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء) رئیس احمد جعفری نے آزادیٔ ہند کے حاشیے میں بھی اس حادثے کا ذکر کیا ہے۔ "قائدِ اعظم کو، نہ صرف قائدِ اعظم کو بلکہ ان کی مرحومہ اور مومنہ بیوی تک کو کافر اور "کافرہ" کہا گیا۔ اور یہ معمولی لوگ نہ تھے احرار کے مولانا مظہر علی اظہر صاحب اور دیوبند کے مولانا حسین احمد جیسے جلیل القدر اکابر تھے۔" (آزادیٔ ہند۔ صفحہ ۱۵۱)۔ مشہور صحافی عبد الکریم عابد مولوی حافظ لقاء اللہ صاحب کے الفاظ میں رقم طراز ہیں: "مولوی غلام غوث ہزاروی، اگست ۱۹۴۷ء تک قائدِ اعظم اور نظریۂ پاکستان کے خلاف رہے۔ لاہور میں احرار کا وہ جلسہ جس میں قائدِ اعظم کو کافرِ اعظم کہا گیا، اس کے صدر بھی غلام غوث ہزاروی تھے" (ہفت روزہ زندگی لاہور ۲۹ ستمبر ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۳۸)

مجلسِ احرار کے "دماغ" چودھری افضل حق مسلم لیگ اور پاکستان کے بارے میں یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں: "لیگ کا نقاب اوڑھے ہوئے انگریز کا ایجنٹ ایسے مواقع کی تاک میں رہتا ہے کہ کب کانگرسی مسلمان کی زبان سے کوئی غیر محتاط کلمہ نکلے اور اسے عوام میں بدنام کرنے کا موقع میسر آئے۔" (آپ رفتہ از

چودھری افضل حق۔ مرتبہ جانباز مرزا۔ کلاسیک لاہور۔ پہلی بار ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۵۷)۔
"میرا مسلمانوں کو یہ مشورہ ہے کہ ہم اپنے روزِ استخلاص کو قریب لانے کے بجائے پاکستان کی خیالی سکیم کے بحث و مذاکرہ پر کیوں اپنا وقت ضائع کریں۔" (پاکستان اور اچھوت از چودھری افضل حق۔ مکتبۂ اردو لاہور۔ طبع اول۔ صفحہ ۹۷)"... بغرض اکھنڈ ہندوستان اور اس پاکستان دونوں جگہ بچارے مسلمان کا کونڈا ہو گا۔ احرار اُس پاکستان کو پلیدستان سمجھتے ہیں جہاں اُمرا بھوک کو چُورن سے بڑھاتے ہوں اور غریب غم کھاتے ہوں۔" (خطباتِ احرار، مرتبہ شورش کاشمیری۔ مکتبۂ احرار لاہور۔ بار اول مارچ ۱۹۴۴ء۔ صفحہ ۸۳۔ ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس قصور میں یکم دسمبر ۱۹۴۱ کو چودھری افضل حق کا آخری خطبہ)

امیرِ شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے کہا: "میں پاکستان قبول کرنے میں مسلمانِ ہند کی ذلت آمیز شکست دیکھ رہا ہوں۔ میری سمجھ میں پاکستان کے حق میں کوئی دلیل بھی نہیں آتی۔ پاکستان کا بننا تو بڑی بات ہے، کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی پ بھی بنا سکے۔" (روزنامہ آزاد۔ ۹ نومبر ۱۹۴۶ء۔ بحوالہ "قیامِ پاکستان کا تاریخی و تہذیبی پس منظر" از سمیع اللہ قریشی۔ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ایڈیشن اول ۱۹۷۷ء۔ صفحہ ۱۰۸)

۸ جولائی ۱۹۴۵ کو مولانا حبیب الرحمٰن صدر مجلسِ احرارِ اسلام ہند نے مندرجہ ذیل بیان یونائیٹڈ پریس کو دیا: "میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ملک عمومی حیثیت سے اور مسلمان خصوصی حیثیت سے مولانا ابوالکلام کے ہاتھ میں محفوظ ہیں۔ مسلمانوں کو ان پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں مسٹر جناح کو مدت سے جانتا ہوں۔ انہیں ہندوستان کی ساری اسلامی آبادی کا اعتماد حاصل نہیں۔" (سعادت لائلپور۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۵)

جناب عنایت اللہ مشرقی نے شاہی مسجد کے باہر تقریر فرماتے ہوئے

کہا۔ "پاکستان کا خیال انگریز کی پیداوار اور اسلام کے خلاف ہے اور قرآن کی تعلیم سے منحرف کرنے والا ہے ۔۔۔۔" (سعادت لائلپور، ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء)

مولانا ابوالکلام آزاد بھی کہتے ہیں: "میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری طبیعت قبول نہیں کرتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا ایک حصہ تو پاک ہے اور باقی ناپاک۔ پاک اور ناپاک کی بنیاد پر کسی قطعۂ ارض کی تقسیم قطعاً غیر اسلامی اور روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے ۔۔۔۔" (آزادئ ہند صفحہ ۱۲۷)

متحدہ قومیت کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں، "ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم میں ایک ہی زبان ہونے لگی۔ ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر دیا۔ ہمارا پُرانا لباس تاریخ کی پُرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری "متحدہ قومیت" کی ایک دولت ہے ۔۔۔ اگر ایسے مسلمان موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اُس گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی یہی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں، بہتر ہے کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے ۔۔۔۔ اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں

بنا سکتا۔" (مسلمان اور کانگرس از مولانا ابوالکلام آزاد۔ صفحہ ۲۹، ۳۰، ۳۱)۔

ڈاکٹر محمود نے متحدہ قومیت کے برگ و بار کو یہاں تک پھیلا دیا ہے کہ فرمایا "اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ہندو اور مسلمان ایک مشترکہ نام (مثلاً) عبدالغفار گاندھی اختیار کر لیں۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ہی ملک ایسا ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔" (نظام نوادر مجاہد پاکستان۔ ف۔ا، اختر۔ یونیورسل ٹریڈنگ ایجنسی لاہور۔ ص ۲۲۶)

گاندھی جی کے حادثۂ قتل کے چند روز بعد فروری ۱۹۴۸ء میں کانسٹی ٹیوشن کلب نیو دہلی میں مولانا آزاد نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا۔ "جہاں تک میرا مطالعہ ہے، دنیا کے تمام مذاہب میں نظریۂ توحید کو جس مذہب نے سب سے زیادہ قریب سے دیکھا ہے، وہ ہندو مذہب ہے۔ میرے پاس اس کے بہت سے تاریخی شواہد و نظائر موجود ہیں۔" اسی تقریر میں گاندھی جی کے متعلق کہا: انہوں نے ہندو مذہب و دماغ کی ایک نئی تعبیر کی تھی اور ایک نیا زاویہ بنایا تھا جو تمام حد بندیوں پر چھا گیا اور وہ ایسی جگہ بن گئی کہ نہ وہاں جغرافیہ اور قومیت کی لکیریں چل سکتی ہیں، نہ اور دوسری حد بندیوں کی دیواریں قائم رہ سکتی ہیں، یہ وہ بلندی ہے کہ اگر ہمارا دماغ وہاں تک پہنچ سکے تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے۔" (روزنامہ الجمعیۃ دہلی۔ آزاد نمبر۔ ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء۔ "انسانی عظمت و سربلندی کا حقیقی راز۔" مولانا آزاد کی ایک غیر مطبوعہ تحریر)

ظاہر ہے کہ اتنی "اسلامی سوچ" رکھنے والے "امام الہند" اور "مفسر قرآن" کے نقطۂ نظر کے ساتھ ملک کے مسلمان، قائداعظم اور اقبال جیسے "علم دین سے ناآشنا" حضرات اور علماء و مشائخ متفق نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد بھی متحدہ قومیت کے داعیوں اور دو قومی نظریے کے

۔حامیوں کے دلوں میں پاکستان کی مخالفت ہی رہی اور اب تک ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ" اقبال اور ابوالکلام کے ذہنی فاصلے" میں لکھتے ہیں: "علامہ اقبال نے مسائل و مشکلات کے بارے میں صدہا اہل و علم و فضل سے مشورہ کیا ـــــــ اس فہرست میں اصاغر بھی ہیں اور اکابر بھی، علمائے دین بھی ہیں اور فضلائے جدید بھی۔ مگر فہرست سے جو نام غائب ہے، وہ ابوالکلام ہے۔ اُدھر امام الہند نے تذکرہ سے لے کر غبار خاطر تک اپنی نثر کو فارسی اردو کے متعدد شعرا کے شعروں سے مزین کیا لیکن اگر نہیں کیا تو علامہ اقبال کے شعروں سے۔" (مسائلِ اقبال۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور۔ ایڈیشن اول مئی ۱۹۷۴ء۔ صفحہ ۲۲۲)

میرزائیت کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے موقف کو ڈھانکنے چھپانے کے لیے مولانا غلام رسول مہر اور شورش کاشمیری نے بہت کچھ کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ "مسائلِ اقبال" میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔" ابوالکلام کے نقطۂ نظر میں وسیع المشربی کا میلان پایا جاتا ہے اور اقبال کے نقطۂ نظر میں سختی اور تشدد کا رنگ نظر آتا ہے۔ قادیانیوں کے متعلق اقبال کے خیالات سب کو معلوم ہیں مگر ابوالکلام کی کوئی متشددانہ رائے ان کے بارے میں ظاہر نہیں ہوئی۔ قتلِ مرتد کے مسئلے پر بھی یہی حال ہے۔ غرض اس نوع کے جملہ مسائل میں ابوالکلام کا میلان لبرل اور اقبال کا میلان متشددانہ ہے۔" (صفحہ ۲۲۵)

۲۰/اپریل ۱۹۵۶ کو ڈاکٹر انعام اللہ خاں سالاری پنشنر ۱۲۰۱۔کوچہ خوشی محمد بلوچستان نے مولانا ابوالکلام کو لکھا" یہ مرزائی لوگ آپ کی طرف مختلف معاملات منسوب کرتے رہتے ہیں اور بعض حوالہ جات بھی دیتے رہتے ہیں مثلاً تذکرہ وکیل وغیرہ۔ وہ کہتے ہیں، مولانا وفاتِ مسیح کے قائل ہیں۔کبھی کہتے ہیں، مولانا نے مرزا صاحب

کی تعریف کردی ہے۔ براہِ کرم ایسی فیصلہ کُن کتاب لکھ دیں کہ پھر بولنے کی جرأت نہ رہے ؟" مولانا نے سائل کو جو جواب دیا، وہ جتنا مستور ہے، حقیقت میں اُس سے زیادہ کھُلا ہے۔ فرماتے ہیں۔ " وفاتِ مسیح کا ذکر خود قرآن میں ہے۔ مرزا صاحب کی تعریف یا بُرائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے کہ

تُو بُرا ہے تو بھلا ہو نہیں سکتا اے ذوق
وہ بُرا خود ہے کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے"

(ملفوظاتِ آزاد۔ مرتبہ محمد اجمل خاں۔ مکتبۂ ماحول کراچی۔ پہلی بار۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء۔ صفحہ ۱۳۰)

عبدالمجید سالک نے "یارانِ کہن" میں مولانا ابوالکلام کے ذکر میں لکھا تھا۔ "مولانا ابوالکلام، مرزا صاحب (غلام احمد قادیانی) کے دعوائے مسیحیتِ موعود سے تو کوئی سروکار نہ رکھتے تھے لیکن ان کی غیرتِ اسلامی اور حمیتِ دینی کے قدردان ضرور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جن دنوں مولانا امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت پر مامور تھے اور مرزا صاحب کا انتقال بھی انہی دنوں ہوا تو مولانا نے مرزا صاحب کی حمایتِ اسلامی پر ایک شاندار شذرہ لکھا۔ امرتسر سے لاہور آئے اور یہاں سے مرزا صاحب کے جنازے کے ساتھ بٹالے تک گئے۔" یارانِ کہن ، مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ لاہور نے چھاپی تھی۔ کوئی گیارہ برس بعد کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو سالک صاحب فوت ہو چکے تھے، ناشر نے لکھا کہ سالک صاحب ۲۳ اپریل ۱۹۵۶ کے چٹان میں اس تحریر کی تردید و تصحیح فرما چکے ہیں اس لیے مولانا غلام رسول مہر نے حسبِ تردید تصحیح فرما دی ہے۔" (یارانِ کہن۔ عبدالمجید سالک۔ مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ لاہور۔ ایڈیشن دوم، ۱۹۶۶۔ صفحہ ۵)

اس طرح شورش اور غلام رسول مہر صاحبان نے بزعمِ خویش معاملہ ٹھیک

کر دیا لیکن نہیں جانتے تھے کہ سید انیس شاہ جیلانی اس مسئلے پر عبدالمجید سالک صاحب کے خطوط شائع کر کے معاملے کو پوری طرح "بگاڑ" چکے ہیں۔ جیلانی صاحب نے اپنی کتاب "نوازش نامے" میں اس موضوع پر لکھا "سہ روزہ دعوت لاہور اسے لے اڑا اور اپنی ۳۱ جنوری ۱۹۵۶ کی اشاعت میں "مسٹر عبدالمجید سالک کی بہتان طرازیاں" عنوان باندھا اور لکھا۔ ۔ ۔ ۔ آئندہ شمارے میں پس منظر یہ پیش کیا گیا کہ "وکیل" کا شذرہ مولانا کے قلم سے نہیں تھا، بٹالہ نہیں گئے، شورش سے التجائیں (اُلجھے اس ڈر سے نہیں کہ جواب ترکی بہ ترکی ملتا ۔ ۔ ۔ ۔) کہ یہ صفحات ہی کتاب میں سے اُڑا دو۔ ۔ ۔ ۔ دعوت کی تحریک پر مولانا آزاد کے سیکرٹری اجمل خاں کا ایک تردیدی "چٹھا" بھی آ گیا اور چٹان میں شائع بھی ہو گیا۔ ادھر سالک نے بھی از راہِ مروت و رفع شر اپنے لکھے پر اصرار نہ ہونے کا اقرار نامہ چھپوا دیا۔ یاروں نے بزعم خود میدان مار لیا تھا لیکن سنجیدہ طبقہ سالک اور واقعات کو بخوبی جانتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ شورش جیسا غالی ابوالکلامی پوری ذمہ داری کے ساتھ ناشر کے فرائض انجام دے تو اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ جو کچھ سالک کے قلم سے نکلا، وہ حقائق کی واضح اور صحیح تصویر ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور مولانا، قادیانیوں کے باب میں آخر وقت تک رواداری ہی برتتے رہے، ہاں دکھاوے کے لیے تردید بھی کر دی۔" (نوازش نامے۔ مرتبہ انیس شاہ جیلانی۔ حیرت شملوی اکادمی، محمد آباد مغربی پاکستان۔ ایڈیشن اول ۱۹۶۵۔ صفحہ ۱۲۰، ۱۲۱)

"نوازش نامے" میں سالک کا ۹ فروری ۱۹۵۶ کا خط ہے، وہ لکھتے ہیں: "میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل حقیقت ہے۔ وکفیٰ باللہ شہیدا۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے بارہا لوگوں نے استفتا کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مرزا قادیانی کو کافر قرار دیں لیکن انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ مرزا صاحب کافر

نہیں مؤول ضرور ہیں اور مؤول کو گمراہ کہا جاسکتا ہے، کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ واقعہ ہے کہ مولانا ابوالکلام جب اخبار وکیل کے ایڈیٹر تھے اور زیادہ سے زیادہ اٹھارہ بیس سال کے تھے، مرزا غلام احمد کے انتقال پر ان کے جنازے کے ساتھ بٹالہ تک گئے اور انہوں نے مرزا صاحب کے انتقال پر وکیل میں ایک تعریفی نوٹ لکھا جس کو مرزائی سینکڑوں دفعہ دہرا چکے ہیں لیکن مولانا نے کبھی اس کی تردید نہیں کی، نہ یہ لکھا کہ یہ نوٹ میرے قلم سے نہیں ہے ۔۔۔۔ میں نے جو کچھ دیکھا لکھ دیا ہے۔ اس کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہوں۔" (صفحہ ۱۵، ۱۶)

۱۳ فروری ۱۹۵۶ کو انیس شاہ جیلانی کے نام اپنے دوسرے خط میں سالک نے لکھا، "مجھے شورش صاحب نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے پرائیویٹ سیکرٹری مولوی اجمل خاں نے دو باتوں کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ مولانا مرزا غلام احمد کے جنازے کے ساتھ امرتسر سے بٹالہ تک نہیں گئے تھے اور مرزا صاحب کے انتقال پر جو شذرہ "وکیل" میں چھپا تھا، وہ مولانا کا لکھا ہوا نہ تھا بلکہ کوئی صاحب عبدالمجید کپورتھلوی تھے، انہوں نے لکھا تھا (میرا خیال ہے "دعوت" والوں نے اپنا پرچہ بھیج کر مولانا سے تردید کی استدعا کی ہوگی) ۔۔۔۔ اب میں کیا عرض کروں۔ مرزائیوں نے آج سے ۴۸ سال پہلے بیان کیا تھا کہ مولوی محی الدین احمد آزاد کلکتہ والے جو وکیل کے ایڈیٹر ہیں، انہوں نے بے حد ہمدردی کا اظہار کیا اور ہمارے ساتھ امرتسر سے بٹالہ تک گئے، جب ہم مرزا صاحب کا جنازہ لے جا رہے تھے ۔۔۔ اب اگر مولانا نصف صدی کے بعد اس کا انکار کرتے ہیں تو میرے لیے اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ سر تسلیم خم کر دوں۔ دوسری بات شذرہ کے متعلق ہے۔ اڑتالیس سال کے دوران میں مرزائیوں

نے سینکڑوں بار اس شذرہ کو شائع کر کے اس کو مولانا ابوالکلام سے منسوب کیا لیکن اس طویل مدت میں مولانا یا ان کے کسی قریبی نیازمند نے اس کی تردید نہ کی حالانکہ اس وقت تردید کی ضرورت بھی تھی۔ اس کے علاوہ جب مولانا وکیل کے ایڈیٹر تھے تو اس کے ایڈیٹوریل صفحہ کے تمام مندرجات کی ذمہ داری لازماً انہی پر عائد ہوتی ہے۔ اگر انہوں نے وہ شذرہ خود اپنے قلم سے نہیں لکھا تو کم از کم اسے اشاعت کے لیے پاس تو کیا ہی ہوگا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ حصۂ اداریہ میں کوئی مضمون ان کے عقائد کے خلاف درج ہو جاتا ـــــ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے اپنی تحریر پر ہرگز اصرار نہیں۔ مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ گزشتہ چالیس سال سے جو قلبی و روحانی تعلق ہے، وہ مرزا غلام احمد یا احمدیوں سے کیونکر ہو سکتا ہے میرے لیے یہ الزام ناقابلِ برداشت ہے کہ میں نے مولانا کے سلسلے میں کوئی غلط بیانی کی یا میری کسی تحریر سے مولانا کے خلاف کسی حلقے میں غلط فہمی پیدا ہوئی۔ میں ایک مختصر سا کھلا مکتوب چٹان کے ذریعہ سے پیش کر رہا ہوں جو غالباً آئندہ ہفتے کے چٹان میں شائع ہو جائے گا۔" (نوازش نامے۔ صفحہ ۱۷، ۱۸، ۱۹)

۷ر مارچ ۱۹۵۶ء کے خط میں مولانا سالک نے مزید لکھا: "آج ربوہ سے مجھے یہ اقتباس موصول ہوا ہے۔ از آئینہ صداقت مرتبہ مفتی محمد صادق صاحب مطبوعہ جولائی ۱۹۰۸ء۔ نول کشور سٹیم پریس لاہور۔ صفحہ ۱۱۳۔ "مسلمان صاحبان نے بھی ایسا ہی شرافت کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ مثلاً خواجہ یوسف شاہ رئیس و آنریری مجسٹریٹ امرتسر ایڈیٹر کرابیکل کلکتہ اور جناب مولانا ابوالکلام آزاد جو ہمدردی کے اظہار میں اسٹیشن تک تشریف لائے۔۔۔۔ (وغیرہ)" ـــــ مجھے یاد تھا کہ مولانا اسٹیشن ہی تک تشریف نہیں لائے بلکہ گاڑی میں بیٹھ کر بٹالہ تک گئے۔ کم از کم ان کا بہ نیت اظہارِ ہمدردی اسٹیشن تک تشریف لانا تو مسلّم ہو گیا۔ میرا خیال

ہے کہ امرتسر سے بٹالہ تک کا سفر بھی کسی نہ کسی ماخذ سے ثابت ہو جائے گا۔" (نوازش نامے۔ صفحہ ۲۰، ۲۱) ۶ اپریل ۱۹۵۶ کو انہوں نے اپنے ایک اور خط میں جیلانی صاحب کو لکھا:"۔۔۔ بہرحال میں تو اب اس بحث میں خاموش ہو چکا ہوں۔ مولویوں اور احمدیوں کو آپس میں بحث کرنے دیجئے۔ اصل معاملہ تو آپ کو لکھ ہی چکا ہوں۔" (صفحہ ۲۳) دو برس بعد، ۲ فروری ۱۹۵۸) کو پھر انہوں نے لکھا۔" مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے مولانا ابوالکلام کے سفرِ بٹالہ کے متعلق مجھ سے خط و کتابت کی تھی ۔۔۔" (صفحہ ۳۰) [مضمون کے آخر میں حاشیہ ۱ ملاحظہ فرمائیں]

مولانا ابوالکلام آزاد کے قادیانیت کے بارے میں رویّے کے متعلق محولہ بالا اقتباسات خاصے طویل بھی ہیں اور موضوع سے کسی حد تک غیر متعلق بھی۔ لیکن میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، صرف مسلم لیگ یا قائدِ اعظم یا علما و مشائخ کے خلاف صف آرا نہیں تھے، سیاسیات ہو یا معتقدات، ان کی فکر کا دائرہ حدود سے تجاوز کر جاتا ہے اور وہ اپنے محدود شخصی یا گروہی مفادات کے باعث شعائرِ دین بلکہ بعض اوقات نصوص تک کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر کوئی صاحب مجھ پر یہ الزام لگانا چاہتے ہوں کہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد کے قادیانیت کے بارے میں خیالات کو سامنے رکھ کر میں پورے گروہ کو خواہ مخواہ مطعون کر رہا ہوں تو گزارش ہے کہ جو لوگ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہوں گے، وہ کسی بھی "اتحاد" کے حامی ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے مولانا عبید اللہ سندھی کے اس سلسلے میں خیالات کیا ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ہم اس وقت جس مذہبیت کا شکار ہو رہے ہیں، مذہبیت روگی ہو چکی ہے، یہ سُنّی کو شیعہ سے لڑاتی ہے، اہلِ حدیث کا دل حنفی سے میلا کرتی ہے، احمدی اور غیر احمدی میں نفرت ڈالتی ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو

ایک دوسرے کا جانی دشمن بناتی ہے۔۔۔۔۔۔میں اس روگی مذہبیت کو مٹانا چاہتا ہوں۔" (عبید اللہ سندھی، حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار۔ پروفیسر محمد سرور (جامعہ ملیہ دہلی) سندھ ساگر اکادمی لاہور۔ اشاعتِ چہارم اکتوبر ۱۹۶۹۔ صفحہ ۴۲۹) [مضمون کے آخر میں حاشیہ ۲ ملاحظہ فرمائیں]

کانگرسی مولویوں کے "امام الہند" اور مفسرِ قرآن کے قادیانیت کے بارے میں "نرم گوشے" کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی حالت بھی پیشِ نظر رہے تو بہتر ہے۔ گھر کی گواہی لیجئے، مولانا عبدالماجد دریابادی کہتے ہیں: " اندرونی حالات مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور دوسرے ندویوں سے جو معلوم ہوتے رہتے تھے اور جہاں ان کی ذہانت، طباعی، حاضر دماغی اور قوتِ حافظہ کی مدح و داد میں ہوتے تھے، وہیں ان کی دینی و اخلاقی حالت کی طرف سے کچھ اطمینان بخش نہ تھے اور غضب یہ تھا کہ خود مولانا شبلی بھی ان روایتوں کی کھل کر تردید نہیں کرتے تھے۔ راوی یوں بھی فی الجملہ ثقہ و معتبر ہی تھے، اب گویا مہرِ تصدیق لگ گئی۔" (معاصرین، عبدالماجد دریابادی۔ مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی۔ سلسلہ مطبوعات نمبر ۳۰۔ صفحہ ۱۸۵)

ساتھیوں کی گواہی پر بات ٹھہری ہے تو پنڈت جواہر لال نہرو کے پرنسپل سیکرٹری ایم او متھائی کی بھی سنیے۔ انہوں نے اپنی کتاب "نہرو دور کی یادیں" کا باب ۲۸ ہی "ابوالکلام اور شراب" باندھا ہے۔ لکھتے ہیں: "جہاں تک ان کے تقدس مآب ہونے کا تعلق ہے، وہ ان کے دینی علم اور ان کی شہرۂ آفاق تفسیرِ قرآن تک محدود ہے۔ اس کے علاوہ تو وہ ایک دنیادار انسان تھے اور زندگی کی رنگینیوں کو پسند فرماتے تھے۔ ۱۹۴۵ میں مولانا جیل سے رہا ہو کر آئے تو اخلاق و مذہب میں "کٹر" نظریات کے بعض لوگوں نے گاندھی جی کو رپورٹ

دی کہ جیل میں مولانا باقاعدگی سے شراب پیتے رہے ہیں۔" (نہرو دور کی یادیں۔ ایم او متھائی/مترجم نذیر حق۔ عزیز پبلشرز، اردو بازار لاہور۔ اشاعت اول صفحہ ۱۴۶)

ان سب حقائق کے باوجود اندھی عقیدت کے مظاہر اپنی جگہ اٹل حقیقت سکتے ہیں۔ انہی "امام الہند" کے بارے میں شورش کاشمیری مدحت سرا ہیں: "(آزاد) عربوں میں ہوتے تو ابن تیمیہ ہوتے، ہندوؤں میں ہوتے تو اب تک ان کے بت پجتے ہوتے لیکن وہ مسلمانوں میں تھے ۔۔۔۔۔ ابوالکلام ابوالکلام نہ ہوتے تو تاج محل ہوتے اور اگر محل انسانی پیکر میں ڈھل جائے تو وہ ہرگز ہرگز ابوالکلام نہیں ہوسکتا

آفاقہا گردیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

(چہرے۔ شورش کاشمیری۔ مکتبہ ماحول کراچی۔ بار اول، جنوری ۱۹۶۵ صفحہ ۳۹، ۴۱)

زیر نظر مقالے میں متحدہ قومیت کے داعیوں کے متعلق گفتگو کی جا رہی ہے متحدہ قومیت کے بارے میں کچھ باتیں پہلے ہوچکی ہیں، مزید سنیے۔ آل انڈیا نیشنل کنونشن (مارچ ۱۹۳۷) کا خطبۂ صدارت دیتے ہوئے جواہر لال نہرو نے دو قومی نظریے کی یوں تغلیط کرنا چاہی "ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔" (قیام پاکستان کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر۔ صفحہ ۳، ۱۴۴)۔ متحدہ قومیت کے حوالے سے مولانا حسین احمد مدنی کے متبعین نے بہت کچھ واویلا کیا ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ اقبال و مدنی کی "صلح" ہوگئی تھی، غلط فہمی رفع کر دی گئی تھی۔ مولانا مدنی کے اکثر نام لیوا یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے یہ کہا ہی نہیں تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" لیکن بعض لوگ مختلف لبادوں میں متحدہ قومیت کی راگنی آج تک الاپنے کا فریضہ انجام دے رہے

ہیں۔ اس سلسلے میں جناب طالوت نے مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کی خط و کتابت بھی شائع کر دی مگر مقصد صرف یہ رہا کہ حقیقتِ حال پر پردہ ڈالا جا سکے۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں :- ۔۔۔ اس پر بحث چل نکلی اور دونوں بزرگوں کے درمیان تحریری تبادلۂ خیال بھی ہوا جسے نظریۂ قومیت کے نام سے مولانا طالوت نے کتب خانہ صدیقیہ ڈیرہ غازی خاں سے شائع کر دیا۔ اس میں علامہ کی ایک تحریر درج نہیں ہے لیکن وہ "حرفِ اقبال" میں ۹ مارچ ۱۹۳۸ کے بیان کے طور پر محفوظ ہے۔" (اقبال اور پاکستانی قومیت۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ مکتبہ عالیہ لاہور۔ ۷۷ ۱۹ صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶)

اس مسئلے پر علامہ اقبال کو مولانا حسین احمد صاحب کے حواریوں اور کانگرس کے پجاریوں کی طرف سے جتنی ملاحیاں سنائی گئیں اور جس طرح دشنام و اتہام کا ہدف بنایا گیا "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ نجم الدین اصلاحی مرتب مکتوباتِ شیخ الاسلام لکھتے ہیں :- "ہم ڈاکٹر صاحب کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں کیونکہ ہم نے ان کے کلام کو بغور پڑھا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ مرحوم کے جہاں سینکڑوں اور ہزاروں اشعار مفید ہیں، وہیں ان کے کتنے ہی اشعار ایسے ہیں جن سے کھلے بندوں اسلام اور اسلامی فلسفہ پر اس کی زد پڑتی ہے۔ ۔۔۔۔ پاکستان میں قانون سازی کا اصول فکرِ اقبال کی روشنی میں تو ہو سکتا ہے کیونکہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے، وہ مرحوم ہی کے فلسفہ کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم اکابر اولیاء اسلام کے دوش بدوش بلکہ مع شیٔ زائد رتبہ دے دیا جائے تو یہ بھی کم ہے مگر ہم ہندی طالب علموں کے نزدیک تو ڈاکٹر صاحب

کا وہی مقام ہے جو علامہ اقبال احمد صاحب سہیل مرحوم کا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آخر الذکر وکالت کی نذر ہو کر رہ گئے اور اول الذکر پنجاب کی نبوت خیز زمین کی بدولت آج شارح اور مقنن اسلام وغیرہ کے ناموں سے یاد کیے جا رہے ہیں۔۔۔ مانا کہ ڈاکٹر صاحب بہت بڑے فلسفی کہے جا رہے ہیں لیکن جہاں تک شاعری اور وہ بھی اردو فارسی شاعری کا درجہ ہے (اقبال احمد) سہیل صاحب کا مقام ان سے بہت زیادہ بلند ہے۔۔۔" (مکتوبات شیخ الاسلام حصہ سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی۔ مکتبۂ دینیہ دیوبند۔ پہلی بار اپریل ۱۹۵۹ء صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲)

ہفت روزہ زندگی لاہور کے نمائندۂ خصوصی نے ۶ جولائی ۱۹۶۰ء کے شمارے میں جامعہ مدنیہ لاہور کی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا تھا "۔۔۔ قائدِ اعظم اور اقبال کے بارے میں یہاں کے اساتذۂ کرام اب بھی کھلے بندوں انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو اُن کے مرشد حضرات کرتے رہے ہیں۔ قائدِ اعظم کو جن الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے، اُنہیں دُہرانا بھی قابل شرم ہے۔ اقبال کے بارے میں نرم سے نرم جملہ جو یہاں نقل کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے "اقبال جہنم میں جل رہا ہوگا کیونکہ اس نے ایک مقدس ہستی (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم) کی مخالفت کی تھی"۔۔۔ مذکورہ بالا نقل و حرکت سے اس شبہے کو تقویت ملتی ہے کہ یہ مدرسہ پاکستان دشمن سرگرمیوں کا اڈہ بن گیا ہے۔" (صفحہ ۲۹)

کانگرسی مولویوں کے کچھ پاکستانی ایڈیشن تاویل کرتے ہیں کہ مولانا حسین احمد مدنی نے قوموں کو اوطان سے مشتق نہیں بتایا تھا، یہ کہا تھا کہ "موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔" ۱۹۳۸ء کی نہیں، مولانا حسین احمد مدنی کی ۱۹۴۵ء کی یہ تقریر ملاحظہ فرمائیں کہ "متحدہ قومیت" کے یہ ڈانڈے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تک ملائے جا رہے ہیں۔۔۔ "اگر آپ کو ان (ہندوؤں) کی طرف سے مایوسی ہی ہے

اوسان کو اپنا ایسا ہی دشمن سمجھتے ہیں کہ جن کو اپنانا ممکن نہیں (حالانکہ یہ آپ کا مذہبی فریضہ بھی ہے) تو وہ معاملہ کیجیے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں پہنچ کر کیا تھا کہ دو دشمنوں میں سے بڑے دشمن سے جنگ کی اور چھوٹے اور کمزور دشمن یہود سے صلح کی اور ہر دو یعنی مسلمانوں اور یہود کو اپنے اپنے مذاہب پر مضبوط رہتے ہوئے مصالح وطنیہ وغیرہ میں ایک قوم بنایا" (خطبۂ صدارت شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی ۴، ۵، ۶، مئی ۱۹۴۵ء سہارنپور حسب الحکم ناظم اعلیٰ جمعیتہ علماء ہند محمد وحید الدین قاسمی نے شائع کیا صفحہ ۳۸) جامعہ ملیہ دہلی میں ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم صوبہ بہار نے بھی فرمایا تھا۔ "ہندو اور مسلمان ایک قوم ہے جو ایک ہی وطن میں رہتی ہے۔ ان کو اپنی قومیت مثا کر ایک ایسا مذہب بنا دینا چاہیے جو دونوں کا مشترکہ مذہب ہو" (پندرہ روزہ سعادت کمالیہ۔ یکم فروری ۱۹۴۲ء) ڈاکٹر اشرف نے اخبار الجمعیتہ (جمعیتہ علماء ہند کا ارگن) میں تحریر فرمایا کہ ہم ہندو مسلمان کے نئے تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی کوشش یہی ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کا ایک مذہب بنا دیا جائے" (ہفتہ وار سعادت کمالیہ۔ ۲۲ جون ۱۹۴۲ء)

جب مسلمان اور ہندو ایک ہی قوم ٹھہرے، ان کا "مذہب" بھی ایک ہی قرار پائے تو پھر ہندو کعبے کو کیوں رونق نہ بخشیں گے اور "بر مسلمان" بت خانوں میں سجدہ ریز کیوں نظر نہ آئیں گے۔ ملاحظہ فرمائیے "۲۲ ستمبر (ہفتہ) کو مسٹر دیوراج سیٹھی ایم ایل اے اور مہاشہ لوڑین چند صدر ڈسٹرکٹ کانگرس لوڈ یہ ٹیک سنگھ میں وارد ہوئے۔۔۔۔ (جلسے میں پڑھی جانے والی نظموں کا ملخص یہ تھا۔ "ہم آزاد کو تلک لگائیں گے۔" "ہندو کعبہ کو بسائیں گے اور حسین احمد مدنی بت خانہ میں سر بسجود نظر آئیں گے۔" "پاکستان کے نظریے دریائے گنگا میں بہائے جائیں

گئے۔" (سعادت کمالیہ۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء)

متحدہ قومیت کی اس بانگی کا لابدی نتیجہ یہ نکلا کہ:

"۱۔ ہندو لیڈروں کو مساجد میں لے گئے، منبروں پر بٹھایا

۲۔ مسلمان مندروں میں گئے، وہاں دعائیں کیں، قشقہ لگوایا

۳۔ گاندھی کے حکم سے ستیہ گرہ کے دن روزہ رکھا

۴۔ وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا

۵۔ کرشن جی کو حضرت موسیٰ کا لقب مان لیا گیا

۶۔ بدایوں کے ایک جلسے میں ایک ہندو معتبر نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان رام لیلا منائیں، ہندو محرم منائیں۔" (الارشاد۔ پروفیسر محمد سلیمان اشرف مطبوعہ خادم التعلیم ۱۹۱۹ء۔ صفحہ ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق لکھنؤ اعتراف کرتے ہیں کہ "آج چار دن سے اس قصبے (دریاباد) پر کانگرسی خیال کے مسلمانوں کا دھاوا ہے، دیوبند کے طلبا کا ایک دستہ آیا ہوا ہے اور اپنے مسلک کی تبلیغ یا کوشش میں مصروف ہے۔۔۔۔ قیام ان کا دھرم شالہ میں ہے حالانکہ قصبہ میں ایک نہیں، دو دو سرائیں مسلمانوں کی موجود ہیں۔ ان کا رہنا سہنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا تمام ہندوؤں کے ساتھ ہے، انہی کے درمیان اور انہی کا سا۔" (صدق لکھنؤ۔ ۲ فروری ۱۹۴۶۔ بحوالہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۶ء)

ظفر الملک مولوی اسحاق علی نے مسٹر گاندھی کے لیے کہا "اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے۔" (دبدبۂ سکندری رام پور۔ یکم نومبر ۱۹۲۰ء)

قیام پاکستان کے بعد "مسٹر گاندھی کی برسی کے موقع پر حافظ جمیعت اللہ اور بابا خضر نے مسٹر گاندھی کی تصویر کے سامنے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کی جگہ

دوسری طرف بھجن گائے جارہے تھے (اخبار سیاست کانپور۔ یکم فروری ۱۹۵۷)
بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم نے گاندھی جی کو ایک خط میں لکھا "جب میری انجمن (ترقیٔ اردو) کا نمائندہ قصبہ پاندھرنا ضلع چھندواڑہ کے مدرسہ میں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ اسکول شروع ہونے سے پہلے ہندو اور مسلمان لڑکے سرسوتی کی مورت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کر رہے ہیں۔ مسلمان لڑکے ان مدرسوں میں پڑھ کر سلام تک بھول گئے ہیں اور اب وہ سلام کی جگہ "نمستے" اور "رام جی کی جے" کہتے ہیں" (مدینہ بجنور۔ ۵ ستمبر۔ بحوالہ الفرقان بریلی، رجب، ۱۳۷۵ھ صفحہ ۸)

۴ جون ۱۹۵۴ء کو مولانا عبد الماجد دریابادی نے مولانا حسین احمد مدنی کو خط لکھا "والا نامہ کے ایک دوسرے پہلو سے متعلق ایک گستاخانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ ہی کے اکابر نے اصاغر کو اس کی اجازت دے رکھی تھی۔ والا نامہ کے چند صفحوں میں کہیں بھی بسم اللہ یا اس کے مماثل کلمہ کا نظر نہ آنا بلکہ بجائے اس کے ہر صفحہ پہ انگریزی حروف میں سجے ہند نظر آنا مجھ نا فہم کی فہم سے بالکل باہر نکلا۔" (مکتوبات شیخ الاسلام۔ صفحہ ۳۹)۔

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ دیوبند مکتبۂ فکر کے لوگوں کا "متحدہ قومیت" کے سحر کا شکار ہونا، اس کی تبلیغ میں خدا اور رسولؐ کے فرمودات کو فراموش کر دینا اور ہندوؤں کی معاشرت میں ڈھل جانا اس لیے تھا کہ ہندو بھی ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ خود مولانا عبد الماجد دریابادی گاندھی جی کے بارے میں کہتے ہیں: "اپنا خیال ہے کہ گاندھی جی توحید کی حد تک تو مسلمان تھے اور خدائے واحد ہی کو خالق، کارساز اور حکمران سمجھتے تھے۔۔۔ ۔۔۔ لیکن رسالت سمجھ میں نہیں آئی ۔۔۔۔ رسول اور نبی ان کے نزدیک برابے

انسان ہوا کرتے تھے۔ نہایت درجہ قابلِ احترام، مصلح و محسنِ انسانیت ہو کر آتے تھے۔" (معاصرین صفحہ ۴۹)

کچھ دوسرے احباب کا خیال ہے کہ کانگرسی علما کا کردار اس حقیقت پر دال ہے کہ انہیں ہندوؤں سے پیسہ ملتا تھا، اگر مسلمان پیسہ دے سکتے تو یہ ان کا ساتھ دے سکتے تھے۔ میں نے جب اس پہلو پر غور کیا تو حقائق کی کئی جہتیں بے نقاب ہوئیں۔ دارالعلوم دیوبند کے لیے ہندوؤں سے خوب چندہ وصول کیا جاتا رہا۔ "سوانح قاسمی" میں ہے " عہدِ قاسمی کی ان ہی قدیم روداودں میں "دستورالعمل چندہ" و "ذکرِ آئین چندہ" کا عنوان قائم کر کے پہلی دفعہ اسی دستور اور آئین کی بایں الفاظ اس زمانہ کی ہر روداد میں ملتی ہے یعنی "چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں اور نہ خصوصیتِ مذہب و ملت"۔ اسی کے ساتھ ان ہی رودادوں میں چندہ دینے والوں کی فہرست میں دیکھ لیجیے اسلامی ناموں کے پہلو بہ پہلو منشی تلسی رام، رام سہائے، منشی ہردواری لال، لالہ بیج ناتھ، پنڈت سری رام، منشی موتی لال، رام لال، سیوا رام سوار وغیرہ اسما بھی مسلسل ملتے جاتے ہیں۔ سرسری نظر ڈال کر مثالاً چند نام جو سامنے آگئے ہیں، وہ چن لیے گئے ہیں۔" (سوانح قاسمی حصہ دوم۔ مناظر احسن گیلانی مکتبہ رحمانیہ لاہور۔ صفحہ ۳۱۷)

مولانا داؤد غزنوی نے سہارنپور کے جلسے میں فرمایا تھا: "جمعیۃ علماء ہند ایک سال میں ہندوستان کی آزادی حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ ہندو سرمایہ دار اور ہندو پریس جمعیت کی امداد کریں (سعادت۔ ۸ جون ۱۹۴۵)۔ پاکستان کے مخالف دیوبندیوں کے صدر مولانا حسین احمد مدنی اور پاکستان کے حامی دیوبندی علامہ شبیر احمد عثمانی کے درمیان ۸ دسمبر ۱۹۴۵ کو تاریخی مکالمہ ہوا۔ اس

میں بھی انگریزوں سے روپے کے حصول کے موضوع پر خوب باتیں ہوئیں (یہ تحریر علامہ شبیر احمد عثمانی کی مصدقہ و مرقمہ ہے) ۔۔۔۔اس گفتگو کے بعد طے ہوا کہ گورنمنٹ ان کو کافی امداد اس مقصد کے لیے دے گی۔۔۔ (افسر نے) گورنمنٹ کو ایک نوٹ لکھا جس میں دکھلایا گیا کہ ایسے لوگوں یا انجمنوں پر حکومت کا روپیہ صرف ہونا بالکل بیکار ہے۔ اس پر آئندہ کے لیے امداد بند ہوگئی۔ اس ضمن میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداءً حکومت کی جانب سے بذریعہ حاجی رشید احمد صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا، پھر بند ہوگیا۔" (مکالمۃ الصدرین۔ ہاشمی بک ڈپو۔ ص ۱۲، ۱۳) مولانا عثمانی نے فرمایا "دیکھیے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے آپ کے مسلّم بزرگ و پیشوا تھے۔ ان کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ان کو چھ سو روپیہ حکومت کی جانب سے دیے جاتے تھے۔" (مکالمۃ الصدرین صفحہ ۱۶)۔

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے ۲ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو بلوچستان کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا "کانگرس کے ساتھ چند مسلمان ہیں۔ وہ گنتی کے مسلمان ہیں۔ کانگرس ان کے ذریعے ملت اسلامیہ کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کانگرس کے پاس دولت ہے لیکن ہمارے ساتھ خدا ہے۔" (افکار قائداعظم۔ مرتبہ محمود عاصم۔ مکتبہ عالیہ لاہور۔ ص ۲۴۷) انہی دنوں قائد نے اپنے ایک بیان میں فرمایا "یہ (کانگرسی مسلمان ہمارے خلاف مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے کام میں بطور کارندے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ یہ مسلمان سدھائے ہوئے پرندے ہیں۔" (روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

شورش کاشمیری کانگرس اور یونینسٹ کی طرف سے مجلس احرار کو ملنے والے روپے کے بارے میں کہتے ہیں " جہاں تک کانگرس کے روپے کا تعلق ہے وہ تو خود مولانا حبیب الرحمٰن کے علم میں ہے بلکہ پچاس ہزار روپے کی قسط دلوانے کے حصہ دار ہی آپ تھے۔ رہا یونینسٹ پارٹی کے روپے کا سوال تو میرا مجز تمام کاغذات شاہ جی (سید عطاء اللہ شاہ بخاری) یا مولانا غلام غوث کو دکھانے کے لیے تیار ہے " (چٹان لاہور۔ ۱۶ راپریل ۱۹۵۱ء " میں (شورش کاشمیری) نے ترتیب وار چارج لگانے شروع کیے۔ کانگرس کا روپیہ ساٹھ ہزار۔ دس ہزار کی ایک قسط اور پچاس ہزار کی دوسری قسط۔ ۔ ۔ ۔ مولانا نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا مظہر علی نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے لیکن اس کے سزاوار وہ تنہا نہیں بلکہ باقاعدہ مشورہ سے رقم قبول کی گئی ہے۔ پہلا دس ہزار روپیہ مولانا داؤد غزنوی نے دیا تھا اور شیخ حسام الدین اس وقت موجود تھے۔ دوسری قسط بھی انہی حضرات کے مشورے سے حاصل کی گئی ۔ ۔ ۔ مولانا ابوالکلام ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ رقم دینے کو تیار ہو گئے مگر سردار پٹیل نے جو کانگرس کے خازن تھے، اس سے اختلاف کیا اور پچاس ہزار روپے کی رقم کا چیک لالہ بھیم سین سچر کی تحویل میں دیا گیا جو اُن کی معرفت احرار میں پہنچا، پھر اس رقم کی بندر بانٹ کی گئی ـــــ " (چٹان لاہور۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۵۱ء۔ " بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل " قسط ۱۰)

ان لوگوں نے " بوجوہ " پاکستان کی مخالفت میں رات دن ایک کر دیے تھے۔ یہ " وجوہ " بھی قارئین پر کسی حد تک ظاہر ہو گئی ہوں گی۔ لیکن یہ کجی اصل میں ان لوگوں کی روحوں پر اثر انداز ہو گئی۔ اسی لیے یہ لوگ اب بھی متحدہ قومیت کے گن گاتے ہیں، دو قومی نظریے کے داعیوں پر زبانِ طعن و دشنام دراز

کرتے ہیں، جن لوگوں نے من حیث الجماعت تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ انہیں گالیاں دیتے ہیں، مسلم لیگ، اقبال اور قائدِ اعظم کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو ماہنامہ الرشید ساہیوال کا مدنی و اقبال نمبر اور ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی کا اقبال نمبر دیکھ لیں جن میں ان حقائق کے کئی پہلو نظر آئیں گے۔ ہفت روزہ زندگی لاہور کے ۶ جولائی ۱۹۷۰ء کے شمارے میں نمائندہ خصوصی نے "ایک مدرسے میں کانگرس کا راج" کے زیرِ عنوان اپنی رپورٹ میں جامعہ مدنیہ لاہور کی کانگرس نوازیوں اور اقبال و قائدِ اعظم علیہم الرحمہ کے خلاف دشنام طرازیوں کو نشر کیا ہے (اس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔)

ترجمان القرآن کو قیامِ پاکستان کے بعد بھی اسی روش پر گامزن دیکھیے جس پر وہ پاکستان کی تحریک کے دنوں میں تھا "اس سارے نامۂ اعمال میں اگر کسی چیز کو نفع کے خانہ میں رکھا جا سکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہوں نے کم از کم آدھے مسلمانوں کو تو بچا لیا اور ان کی ایک قلمی ریاست بنوا دی۔ لیکن افسوس کہ اس "روشن" کارنامے کو بھی ہم بد ترین غلطیوں سے داغدار پاتے ہیں اور بُری طرح اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں"۔ (ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۱۳۶) ۔ ۱۹۴۹ء میں دو قومی نظریے کو "تباہ کن نظریہ" کہا گیا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ "اس فرقہ پرست جماعت (مسلم لیگ) نے ہندوستانی سیاست میں فرقہ پرستی کا زہر پھیلانا شروع کر دیا۔ یہ حال کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے جس سے سب واقف ہیں کہ کس طرح "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ لگا کر مسلم عوام کو گمراہ کیا گیا اور کس طریقے سے دو قوموں کا تباہ کن نظریہ پیش لیا گیا ہے"۔ (نئی زندگی الہ آباد۔ فروری ۱۹۴۹ء، صفحہ ۳۶ مضمون کانگرس اور مومن، از عبد القیوم انصاری)۔ ۱۹۶۲ء میں شورش کاشمیری مسلم لیگ اور دو قومی

نظریے کے سب حامیوں کو "کاسہ لیسوں کا گروہ" قرار دیتے ہیں۔ "وہ مسلمان جو استعمار دشمن تھے، ان پر تو کاسہ لیسوں کا گروہ ہندو کانگرس کا ایجنٹ اور گماشتہ ہونے کا طعن کرتا تھا اور سادہ دل عوام میں ان کے خلاف جھوٹی سچی ہانکنا اس کا مذہب ہوچکا تھا" (بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل صفحہ ۲۵۸) اگست، ۱۹۴۲ء کا ذکر کرتے ہوئے جانباز مرزا کہتے ہیں "آج ملک پر ان لوگوں کا اقتدار تھا جو کل تک اجنبی حکمرانوں کے اقتدار کی عمر بڑھانے میں سرگرمی کو شاں رہتے تھے۔" (آتشکدہ۔ جانباز مرزا۔ انارکلی کتاب گھر لاہور۔ بار اول ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۱۰۲)

ایک صاحب داؤد عسکر نے بھی گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں کی مدحت سرائی میں بہت کچھ لکھنے کے بعد مسلم لیگ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "اب مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت رہ گئی لیکن یہ انگریزوں کی سرپرستی میں ایک نیم سرکاری ادارہ بن چکی تھی۔ اس کی تنظیم کھوکھلی اور مضحکہ خیز تھی اور اس کا پلیٹ فارم طفلانہ حرکتوں کا میدان بنا ہوا تھا۔ اس کی قیادت نوابوں، نوابزادوں، خان بہادروں اور ان کے کاسہ لیسوں اور حاشیہ برداروں پر مشتمل تھی جو اکثر بے ضمیر اور بے کردار قسم کے لوگ ہوتے تھے اور چونکہ اس ٹولے کو سرکاری حمایت حاصل تھی، اس لیے یہ عامۃ الناس میں "ٹوڈی" پارٹی کہلاتی تھی"۔ (جوئے شیر۔ حصہ اول، تالیف داؤد عسکر۔ رشید اینڈ سنز کراچی۔ فروری ۱۹۷۹ء۔ صفحہ ۴۵)

اب یہ سوال پاکستان کے باسیوں سے ہے کہ پاکستان کے مخالفوں کی ریشہ دوانیوں کی راہ میں اب بھی کوئی رکاوٹ کیوں نہیں ہے۔ کیا پاکستان کی برکات سے متمتع ہوکر پاکستان کے نظریے، تحریک، اس کے بانیوں

اور حامیوں کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والوں کی زبان اسی طرح بگٹٹ رہے گی۔ کیا تحریکِ پاکستان میں کام کرنے والے ان سرگرمیوں کا کوئی نوٹس نہیں لیں گے۔ کیا پاکستان کی ہر حکومت قائدِ اعظمؒ، علامہ اقبالؒ، تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف دشنام طرازی کرنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی ——— اور کیا ہم اس حقیقت پر غور کرنے کی کوشش کریں گے کہ اگر ہم نے بے حسی کو اسی طرح شعار کیے رکھا تو ہمارا انجام کیا ہوگا ——— ؟؟؟

حاشیہ نمبر ۱ ۵ مئی ۱۹۰۵ء کو ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر آہ قادیان گئے اور ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء کو آزاد نے قادیان یاترا کی (تاریخِ احمدیت، جلد سوم۔ مولفہ دوست محمد شاہد۔ ادارۃ المصنفین ربوہ صفحہ ۴۰۹) سفرِ قادیان سے متعلق آزاد نے اپنے تاثرات لکھوائے تو بتایا کہ جمعہ کی نماز انہوں نے وہیں پڑھی، مولوی عبدالکریم امام تھے، مرزا صاحب صف سے آگے، مگر امام سے دو اِنچ پیچھے تنہا کھڑے رہے ...... لوگوں نے مجھے پہلی صف میں جگہ دی (ابوالکلام کی کہانی خود اُن کی زبانی، عبدالرزاق ملیح آبادی۔ مطبوعات چٹان لاہور۔ اشاعتِ دوم۔ یکم جنوری ۱۹۶۳۔ صفحہ ۳۳۰) مرزا صاحب کی وفات پر ابوالکلام آزاد نے "وکیل" امرتسر میں ایک طویل اداریہ لکھا۔ "وہ شخص، بہت بڑا شخص جس کا قلم سحر تھا اور زبان جادو ...... مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی رحلت اس قابل نہیں کہ اس سے سبق حاصل نہ کیا جاوے اور مٹانے کے لیے اسے امتدادِ زمانہ کے حوالے کر کے صبر کر لیا جائے۔ ایسے لوگ جن سے مذہبی یا عقلی دنیا میں انقلاب پیدا ہو، ہمیشہ دنیا میں نہیں آتے۔ یہ نازشِ فرزندانِ تاریخ بہت کم منظرِ عالم پر آتے ہیں اور جب آتے ہیں، دنیا میں انقلاب پیدا کر کے دکھا جاتے ہیں۔" (تاریخِ احمدیت جلد سوم۔ صفحہ ۵۷۰، ۵۷۲ بحوالہ بدر۔ ۱۸ جون ۱۹۰۸۔ صفحہ ۳۰۲)

حاشیہ ۲ (الف) حال ہی میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب "احکام اسلام عقل کی نظر میں" (جو پہلی دفعہ میرزا غلام احمد قادیانی کے مرنے کے ۲۴ برس بعد شائع ہوئی) کے مندرجات میرزا صاحب کی کتب ——— تقریر جلسۂ مذاہب (اسلامی اصول کی فلاسفی) برکات الدعار، کشتیٔ نوح، نسیم دعوت، آریہ دھرم اور اخبار الحکم قادیان میں میرزا صاحب کی تحریر سے سرقہ ہے (بحوالہ الفضل ربوہ مورخہ ۵ رمئی ۱۹۸۳، ہفت روزہ لاہور لاہور ۱۶ رمئی ۸۳، ہفت روزہ خدام الدین لاہور ۲۹ رجولائی ۸۳، ہفت روزہ لاہور ۲۷ اگست ۸۳ اور "کمالات اشرفیہ" مرتبہ عبداللہ ایمن زئی مطبوعہ پرنٹنگ ان پریس لاہور) ——— اگر مولانا تھانوی میرزا صاحب کو کافر یا جھوٹا سمجھتے تو اسلام کی حقانیت کی دلیل کے طور پر ان کی تحریریں اپنے نام سے شائع نہ کراتے اور میرزائی اس کھلے سرقے کو سرقہ کہنے سے نہ کتراتے۔

(ب) مولوی محمد لدھیانوی نے ۱۳۰۱ھ میں میرزا ئے قادیانی کے کفر کا فتویٰ دیا تو مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس فتوے کی تردید لکھی جس میں میرزا کو مردِ صالح قرار دیا۔ مولوی محمد لدھیانوی نے اس تردید کا مفصل رد لکھا جس کی تفصیل "فتاویٰ قادریہ" میں موجود ہے۔ (فتاویٰ قادریہ مطبوعہ مطبع قیصر ہند لودھیانہ۔ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ ——— مکتبہ قادریہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے فتاویٰ قادریہ کے اس ایڈیشن کی فوٹو کراکے چھاپ دی ہے) ——— فتاویٰ رشیدیہ میں بھی میرزا کی تکفیر کا کوئی عنوان نہیں ہے۔

(ج) مولوی محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند نے "تحذیر الناس" میں خاتم النبیین کے اجماعی معنی سے انکار کیا اور کہا: "اگر بالفرض بعد زمانۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا"

(تحذیر الناس۔ کتب خانہ امدادیہ دیوبند مطبوعہ برقی پریس دہلی۔ صفحہ ۲۴)

مصنف کی دیگر تصانیف

درفعنالک ذکرک (پہلا مجموعۂ نعت)

حدیثِ شوق (دوسرا مجموعۂ نعت)

مدحِ رسولؐ (انتخابِ نعت)

اقبال و احمد رضا

مدحت گرانِ پیغمبرؐ

نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب

ترجمہ خصائص الکبریٰ

ترجمہ فتوح الغیب

ترجمہ تعبیر الرؤیا

راج دلارے (بچوں کے لیے نظمیں) ——— زیرِ طباعت

نعتِ خاتم المرسلینؐ (انتخابِ نعت) ——— //

ثنائے محمدؐ (انتخابِ نعت) ——— //

ارمان مدینے والے دا (پنجابی نعتاں دا انتخاب) ——— //

والدین کے حقوق ——— //

فکرِ اقبال کی جہات ——— //

فاروقِ اعظمؓ ——— //

تحریکِ پاکستان ——— مثبت اور منفی کردار ——— زیرِ ترتیب

یادِ اسلاف یا تقلیدِ اسلاف ——— غیر مطبوعہ

زعمائے ملت ——— //

اردو کے چند نعت گو ——— //

لمحۂ فکریہ ——— //

علمی مجادلے ——— //

461

نذیر سنز پبلشرز کی مطبوعات

مکتوباتِ نبوی ——— سید محبوب رضوی

فصوص الحکم ——— شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، ترجمہ مولانا عبد القدیر صدیقی

علومِ مصطفیٰ ——— مولانا احمد رضا خان بریلوی

احکامِ شریعت ——— ״

عرفانِ شریعت ——— ״

حدائقِ بخشش ——— ״

الامن والعلیٰ ——— ״

اسلام ——— امام غزالی

علم الکلام ——— ״

فلسفۂ دعا ——— علامہ فضل احمد عارف

سیرت سلمان فارسیؓ ——— ״

برکاتِ بُردہ ——— ״

برکاتِ رمضان ——— ״

اصول الشاشی ——— اسحاق بن ابراہیم شاشی (ترجمہ غلام قادر لاہوری)

الفوز الکبیر ——— حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ترجمہ رشید احمد انصاری)

علمِ حدیث اور چند اہم محدثین ——— سالم قدوائی

معارف الحدیث ——— حافظِ ملت مولانا عبد العزیز

نذیر سنز پبلشرز کی مطبوعات

اسلامی اخلاق ـــــ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

گلدستۂ مثنوی ـــــ مولانا جلال الدین امجدی

احوال العارفین ـــــ حافظ غلام فرید

عربی بولیے ـــــ شفیق مرزا

اعمالِ قرآنی ـــــ مولانا اشرف علی تھانوی

خصوص الکلم فی حل فصوص الحکم ـــــ ″

انسانِ کامل ـــــ حاجی محمد منیر قریشی

یارِ کامل (حضرت ابوبکر صدیق) ـــــ ″

اسلام اور سائنس ـــــ ″

با محمدؐ ہوشیار ـــــ ″

قرآنی دعائیں ـــــ ″

رہنمائے قرآن ـــــ ڈاکٹر میر ولی الدین

حضرت میاں میرؒ ـــــ اقبال احمد

تعلیم الاسلام ـــــ مولانا کفایت اللہ دہلوی

ثنائے محمدؐ (نعتیں) ـــــ مرتبہ راجا رشید محمود

ارمان مدینے والے دا (پنجابی نعتیں) ـــــ ″

نماز اور اس کے مسائل ـــــ اظہر مجموعہ

اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ اور پاکستان ـــــ راجا رشید محمود

ماں باپ کے حقوق ـــــ ″

حلال و حرام ـــــ مولانا فتح محمد لکھنوی